بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿ڈاکٹر انعام الحق﴾

لمعات

محاسبہ خویش

آج کل میڈیا میں اہم شخصیات کے انٹرویو پیش کئے جا رہے ہیں جن میں ان کی زندگی اور نظریات کے بارے میں تفصیلی معلومات کا انکشاف ہوتا ہے۔ ان میں زیادہ تر سیاسی رہنما شامل ہوتے ہیں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنا سیاسی امیج نکھار کر سامنے لائیں جب کہ میڈیا کے Anchors کی کاروباری ضرورت ہوتی ہے کہ وہ ان کی کمزوریوں کو ان کے سامنے لا کر ایک تو ان کو صفائی کا موقعہ دیں اور دوسرے عام قارئین کے لئے توجہ (Attention) حاصل کرنے کے موجب بھی بنیں۔ لہٰذا دیکھا گیا ہے کہ ان میں سیاسی راہنما ہر ممکن کوشش کرتے ہیں کہ وہ ان کمزوریوں کو Justify کرنے کے لئے ہر ممکن عقلی دلائل و تاویل سے جواز تراشے اور ذمہ داری کا بوجھ ضرورت محسوس ہونے پر اپنے حریفوں پر ڈال دے۔ بعینہٖ یہی فریضہ حریف بھی انٹرویو دیتے وقت اپنے کلام سے سرانجام دیتے ہیں، یہ روش عمومی طور پر قرآن میں منافقت کے ضمن میں دی گئی نفسیاتی مرض کے علامات کی نشاندہی کرتی ہیں۔

اس مرض کی تشخیص کلام سے پہچاننے کی خود قرآن سے بھی وضاحت ملتی ہے:

وَلَوْ نَشَاء لَأَرَيْنَاكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُم بِسِيمَاهُمْ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ أَعْمَالَكُمْ (۴۷/۳۰)۔

''اور اگر ہم چاہتے تو ہم تجھے ان (منافقین) کو دکھا دیں۔ (یعنی ہم ایسا نہیں کریں گے کیونکہ یہ چیز ہماری مشیت میں نہیں ہے) پس تو انہیں اسی فہم و فراست کی رو سے ان کے طرزِ کلام سے پہچان سکتا ہے۔ اور اللہ تمہارے اعمال کا علم رکھتا ہے۔''

یاد رہے کہ منافقین کا کوئی الگ گروہ نہیں ہوتا۔ یہ نفسیاتی مرض اس وقت پیدا ہوتا ہے جب بھی کسی کی زباں اس کے دل سے ہم آہنگ نہ ہو۔ یا اس کا کردار اس کے دعویٰ کی تصدیق نہ کرے۔ قرآن نے اسے نفسیاتی مرض بتایا ہے۔

وَمَا يَشْعُرُونَ۔ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ (۲/۹۔۱۰)

''(منافقین) شعور نہیں رکھتے کہ ان کے دلوں میں مرض ہے۔''

کہا جاتا ہے کہ Seeing is believing دیکھ کر ہی یقین آتا ہے، تو کیوں نہ ہم میڈیا کے ان پروگرامز میں سیاسی راہنماؤں کے حریفوں کے متعلق کہے گئے کلام سے اخذ کئے ہوئے تاثرات کا موازنہ قرآن میں درج منافقین کی علامات یا صفات سے کریں تا کہ مرض کی تشخیص ہو سکے۔

قرآن نے منافقین کی بہت سی صفات یا علامات بتائی ہیں۔ ہم البتہ موضوع سے متعلقہ اہم صفات یا علامات کو یہاں درج کرتے ہیں۔

منافقت کی علامات

(۱) اپنی ہی بات کو تبدیل کرنے والے۔

یُحَرِّفُونَ الْکَلِمَ مِن بَعْدِ مَوَاضِعِہِ (۵/۴۱)۔

''(منافقین) باتوں کو ان کی جگہ (جاننے) کے بعد بدلتے ہیں۔''

(۲) پرکشش گفتگو سے جھگڑے کی بنیاد رکھنا۔

وَإِذَا تَوَلَّی سَعَی فِیْ الأَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیہَا وَیُہْلِکَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللّہُ لاَ یُحِبُّ الفَسَادَ (۲/۲۰۴)۔

''اور لوگوں میں سے وہ (منافق بھی) ہے کہ جس کی بات دنیا کی زندگی میں تجھے تعجب (خوشی) میں ڈالتی ہے اور وہ اللہ کو اس پر گواہ بناتا ہے جو اس کے دل میں ہے اور وہ جھگڑا کرنے میں بہت سخت ہے۔''

(۳) غالب آنے کی صورت میں عہد کا لحاظ نہ رکھنے والے۔

کَیْفَ وَإِن یَظْہَرُوا عَلَیْکُمْ لاَ یَرْقُبُواْ فِیکُمْ إِلًّ وَلاَ ذِمَّۃً یُرْضُونَکُم بِأَفْوَاہِہِمْ وَتَأْبَی قُلُوبُہُمْ وَأَکْثَرُہُمْ فَاسِقُونَ (۸/۹)۔

''(عہد) کس طرح ہو حالانکہ اگر وہ تم پر غالب آئیں تو تمہارا کچھ لحاظ نہ کریں نہ ناطے کا اور نہ ہی عہد کا (جب کسی فریقِ مخالف کو نقصان پہنچانے کا موقعہ ملتا تو نہ قرابت کا لحاظ کرتے نہ عہد کی خلاف ورزی کا وہ اپنے مونہوں سے تم کو راضی کرتے ہیں اور ان کے دل انکار کرتے ہیں اور ان میں اکثر نافرمان ہیں۔''

(۴) لوگوں کو دکھانے کی خاطر نیک کام کرنے والے۔

یَا أَیُّہَا الَّذِیْنَ آمَنُواْ لاَ تُبْطِلُواْ صَدَقَاتِکُم بِالْمَنِّ وَالأَذَی کَالَّذِیْ یُنفِقُ مَالَہُ رِئَاء النَّاسِ وَلاَ یُؤْمِنُ بِاللّہِ وَالْیَوْمِ الآخِرِ (۲/۲۶۴)۔

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنی خیرات کو احسان جتا کر اور ستا کر باطل نہ کرو اس شخص (منافق) کی طرح جو اپنا مال لوگوں کے دکھانے کے لئے خرچ کرتا اور اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں لاتا۔''

(۵) دوسروں کو بھی اپنی طرح بنانے کی خواہش رکھنے والے۔

وَدُّواْ لَوْ تَکْفُرُونَ کَمَا کَفَرُواْ فَتَکُونُونَ سَوَاء ۔ (۴/۸۹)۔

''وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی کافر ہو جاؤ جس طرح وہ کافر ہوئے اور یوں برابر ہو جاؤ۔''

(۶) دونوں فریقوں سے بنائے رکھنے والے۔

سَتَجِدُونَ آخَرِیْنَ یُرِیْدُونَ أَن یَأْمَنُوکُمْ وَیَأْمَنُواْ قَوْمَہُمْ (۴/۹۱)۔

''تم کچھ لوگ (منافقین) پاؤ گے جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی امن میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی امن میں رہیں۔''

(۷) فائدے میں ساتھ اور مصیبت میں ساتھ چھوڑ دینے والے۔

إِن تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِن تُصِبْكَ مُصِيبَةٌ يَقُولُواْ قَدْ أَخَذْنَا أَمْرَنَا مِن قَبْلُ وَيَتَوَلَّواْ وَّهُمْ فَرِحُون (۹/۵۰)۔

''اگر تجھے بھلائی پہنچے انہیں (منافقین کو) برا لگتا ہے اور اگر تجھے تکلیف پہنچے کہتے ہیں ہم نے اپنا کام پہلے ہی سے ٹھیک کر لیا تھا اور وہ پھر جاتے ہیں اس حال میں کہ خوشیاں منا رہے ہوتے ہیں۔''

(۸) مقصد سے وابستگی رکھے بغیر مذبذبین کی حالت میں رہنے والے۔

مُّذَبْذَبِينَ بَيْنَ ذَلِكَ لاَ إِلَى هَـؤُلاء وَلاَ إِلَى هَـؤُلاء (۴/۱۴۳)۔

''درمیان میں پریشان ہیں۔ نہ ادھر کے نہ ادھر کے۔''

(۹) صاحبِ اقتدار کا ساتھ دیتے ہیں۔

وَلَئِن جَاء نَصْرٌ مِّن رَّبِّكَ لَيَقُولُنَّ إِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ (۲۹/۱۰)۔

''اگر تیرے رب کی طرف سے مدد و نصرت آئے تو وہ ضرور کہیں گے ہم بھی تمہارے ساتھ تھے۔''

(۱۰) جانتے بوجھتے جھوٹی قسمیں کھانے والے۔

وَيَحْلِفُونَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُونَ (۱۴/۵۸)۔

''اور وہ جھوٹ پر قسمیں کھاتے ہیں اور وہ جانتے ہیں۔''

(۱۱) اپنے وعدوں کو ایفا نہ کرنے والے۔

وَإِن قُوتِلْتُمْ لَنَنصُرَنَّكُمْ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ (۱۱/۵۹)۔

''(منہ سے کہتے ہیں) اور اگر تم سے جنگ کی گئی تو ہم ضرور تمہاری مدد کریں گے اور اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ وہ یقیناً جھوٹے ہیں۔''

(۱۲) دل اور زبان کو ہم آہنگ نہ رکھنے والے۔

إِذَا جَاءكَ الْمُنَافِقُونَ قَالُوا نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُولُ اللَّهِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُولُهُ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ (۶۳/۱)۔

''جب منافق تیرے پاس آتے ہیں' کہتے ہیں ہم گواہی دیتے ہیں کہ تو یقیناً اللہ کا رسول ہے اور اللہ جانتا ہے کہ تو اس کا رسول ہے اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافق یقیناً جھوٹے ہیں (بات صحیح کہتے ہیں لیکن دل اور زبان میں ہم آہنگی نہیں)۔''

(۱۳) ظاہر میں خوشنما لیکن باطن میں کھوکھلے۔

وَإِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ وَإِن يَقُولُوا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ كَأَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ (۶۳/۴)۔

''اور جب تو انہیں دیکھتا ہے تو ان کے جسم تجھے اچھے معلوم ہوتے ہیں اور اگر وہ بات کریں تو تو ان کی بات کو سنے' گویا کہ وہ لکڑیاں ہیں (جنہیں) لباس پہنایا گیا ہے۔''

(۱۴) اپنی اصلیت کو بے نقاب ہونے سے ڈرنے والے۔

يَحْذَرُ الْمُنَافِقُونَ أَن تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُورَةٌ تُنَبِّئُهُم بِمَا فِي قُلُوبِهِم (۹/۶۴)۔

''منافق ڈرتے ہیں کہ ان پر کوئی سورۃ (نہ) اتاری جائے' جوان (دوسروں) کو ان باتوں کی خبر دے دے جوان کے دلوں میں ہیں۔''

(۱۵) ذمہ داری قبول کرنے کی بجائے معذرتیں پیش کرنے والے۔

وَلَئِن سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ (۹/۶۵)۔

''اور اگر تو ان سے سوال کرے تو کہیں گے ہم تو یونہی باتیں اور دل لگی کرتے تھے۔''

(۱۶) منافق مرد ہو یا عورت دونوں سے خیر کے معیار سے دور رہنے والے۔

الْمُنَافِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ بَعْضُهُم مِّن بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمُنكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوفِ وَيَقْبِضُونَ أَيْدِيَهُمْ نَسُوا اللّهَ فَنَسِيَهُمْ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ هُمُ الْفَاسِقُونَ (۹/۶۸)۔

''منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک سے ہی ہیں۔ وہ برے کام کرنے کو کہتے ہیں اور اچھے کاموں سے روکتے ہیں اور اپنے ہاتھ بند رکھتے ہیں (یعنی بخل کرتے ہیں) انہوں نے اللہ (یعنی خیر) کو چھوڑ دیا' سو اللہ نے ان کو بھلا دیا' منافق ہی نافرمان ہیں۔''

(۱۷) انتباہ کرنے کے باوجود خفیہ سازشوں سے باز نہ آنے والے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ نُهُوا عَنِ النَّجْوَى ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا نُهُوا عَنْهُ وَيَتَنَاجَوْنَ بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُولِ (۵۸/۸)۔

''کیا تو نے انہیں نہیں دیکھا' جنہیں خفیہ مشورے سے روکا گیا پھر وہ لوٹ کر اس کی طرف جاتے ہیں جس سے روکے گئے اور زیادتی اور رسول ﷺ کی نافرمانی کا خفیہ مشورہ (سازش) کرتے ہیں۔''

منافقت کے نتائج

درج بالا خصوصیات کے حامل منافقین کے لیڈروں اور ان کا اتباع کرنے والے عوام ہر ایک اپنے افعال کو دوسرے پر ڈال کر بری الذمہ ہونے کی کوشش کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ قرآن نے ان کے مکالمات درج ذیل آیت میں پیش کر کے ان کے متعلق فیصلہ دیا ہے کہ:

وَلَوْ تَرَى إِذِ الظَّالِمُونَ مَوْقُوفُونَ عِندَ رَبِّهِمْ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ الْقَوْلَ يَقُولُ الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا لَوْلَا أَنتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِينَ ○ قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا لِلَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا أَنَحْنُ صَدَدْنَاكُمْ عَنِ الْهُدَى بَعْدَ إِذْ جَاءكُم بَلْ كُنتُم مُّجْرِمِينَ (۳۴/۳۱۔۳۲)۔

''اگر تو دیکھے جب ظالم اپنے رب کے سامنے کھڑے کئے جائیں گے۔ ایک دوسرے کی بات کو لوٹائیں گے۔ جو کمزور تھے وہ انہیں جو بڑے (لیڈر) تھے کہیں گے اگر تم نہ ہوتے تو ہم (منافق کی جگہ) مومن ہوتے۔''

''جو بڑے تھے وہ انہیں جو کمزور تھے کہیں گے کیا ہم نے تمہیں ہدایت سے روکا تھا اس کے بعد کہ وہ تمہارے پاس آ گئی

تھی۔ بلکہ تم خود مجرم تھے۔''

قرآن نے ان دونوں کے متعلق فیصلہ سنایا کہ:

قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَلَـكِن لَّا تَعْلَمُونَ (۳۸/۷)۔

''(خدا) کہے گا ہر ایک (منافق) کے لئے (آگ کا عذاب) دوچند ہے لیکن تم نہیں جانتے۔''

دوسری جگہ منافقین کا جو انجام قرآن نے بتایا ہے تو روح لرز اٹھتی ہے۔

إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَن تَجِدَ لَهُمْ نَصِيراً (۴/۱۴۵)۔

''منافق آگ (عذاب) کے سب سے نچلے طبقہ میں ہیں' اور تو ان کے لئے کوئی مددگار نہیں پائے گا۔''

منافقین کے نفسیاتی مرض کے متعدی جراثیم سے محفوظ رکھنے کے لئے نوع انسانی کے لئے ہدایت ہے کہ:

فَلاَ تَتَّخِذُواْ مِنْهُمْ أَوْلِيَاء (۴/۸۹)۔

''اور ان (منافقون) میں سے کسی کو دوست اور مددگار نہ بناؤ۔''

درجِ بالا منافقت کے ذُمرے میں آنے والی علامات کو محاسبہ خویش ہی کے ذریعے سے محسوس کیا جا سکتا ہے' جس سے لگتا یوں ہے کہ ہم ابھی تک اس کی اہمیت سے ناواقف ہیں یا پھر اصلیت کے بے نقاب ہونے کے خوف سے اسے اپنانا نہیں چاہتے۔ اس کے برعکس محاسبہ دیگر کی روش میں حصہ لینے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ اس کی توجیہہ یوں کی جاتی ہے کہ محاسبہ خویش میں بوریت اور محاسبہ دیگران میں حصولِ لذت کا زیادہ سامان ہوتا ہے۔

آج کے میڈیا نے البتہ مختلف پروگرام ترتیب دے کر حریفوں کو اکٹھا اور آمنے سامنے کر کے محاسبہ دیگراں کے متعدد مواقع بہم پہچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ یہ ڈرامائی پیشکشیں عوام میں مقبولیت حاصل کر رہی ہیں۔ خصوصی طور پر سیاسی زعماء کی شرکت ان کی اپنی تشہیر کے لئے سیاسی ضرورت کا درجہ حاصل کر رہی ہے۔ میڈیا کے لئے کاروباری وسعت کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے' ان کے لئے سیاسی زعماء کی کمزوریوں کی تلاش میں مسابقت محاسبہ دیگراں کے لئے وافر مواد تک دستیابی میں آسانی ہوگئی ہے۔ اس مواد کی تلاش اور موثر اظہار میں خود پروگرامز میں شامل حریف میڈیا کے لئے ممد و معاون ثابت ہو رہے ہیں۔

ان پروگرامز میں دوران بحث میڈیا کے اینکرز بھی شامل گروہ پر اور حریف بڑی بے دردی سے فریقِ مخالف پر ان علامات کا انطباق کر کے منافقت کے تناظر میں ایک دوسرے کو نفسیاتی مریض ثابت کرنے کے لئے ہر ممکن حیلہ اور حربہ استعمال کرنے میں نہیں چوکتے۔ فریقِ مخالف ان کے جواب میں ان کے دلائل کو رد کر کے الٹا انہی پر انہی الزامات کی بوچھاڑ کرتے ہوئے دلائل کے انبار لگا دیتے ہیں۔ اس قابلیت کے مظاہرہ سے عوام برملا اظہار کرنے میں جھجھک محسوس نہیں کر رہے کہ مِن حیث القوم سب کے سب منافقت کی بیماری میں مبتلا ہیں' لہٰذا ہمیں اس حقیقت کے اعتراف ہی میں زندہ رہنا ہے اور اس بیماری سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کاوشیں بے سود ثابت ہوں گی۔ اس مایوسی کی حالت کو قرآن کفر سے تعبیر کرتا ہے۔

لَا يَيْأَسُ مِن رَّوْحِ اللّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُونَ (۱۲/۸۷)۔

''اللہ کی رحمت سے سوائے کافر لوگوں کے اور کوئی مایوس نہیں ہوتا۔''

کوئی بھی مرض لاعلاج نہیں ہوتا۔ جس نے بیماری دی ہے اسی نے اس کی شفاء کا ساماں بھی مہیا کر دیا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے کہ:

قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَى أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعاً (۳۹/۵۳)۔

''کہہ دے اے بندو میرے جنہوں نے کہ زیادتی کی ہے اپنے نفس سے (نفسیاتی مریض بنے) پر مایوس نہ ہو اللہ کی رحمت سے۔ اللہ بے شک تمام لغزشوں (بیماریوں) کی مغفرت (علاج کا سامان) مہیا کرنے والا ہے۔''

اس خوشخبری کے بعد نوع انسانی کے لئے تنبیہہ بھی کی گئی ہے کہ علاج خود مریض نے عمل کر کے کرنا ہوتا ہے چاہے وہ فرد ہو یا اقوام۔

إِنَّ اللّهَ لاَ يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّى يُغَيِّرُواْ مَا بِأَنْفُسِهِمْ (۱۳/۱۱)۔

''اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا (شفاء نہیں دیتا) جب تک وہ اپنی (نفسیاتی بیماری کی) حالت کو نہ بدلیں (یعنی علاج نہ کریں)۔''

ماہرین طب ہماری راہنمائی کرتے ہیں کہ دونوں نفسیاتی اور جسمانی امراض توازن کی کمی بیشی سے رونما ہوتے ہیں۔ ان میں توازن لانا ہی ان کا علاج ہوتا ہے۔ قرآن سے بھی اس امر کی تائید ہوتی ہے کہ یہ توازن کا نظام خدا ہی کا بنایا ہوا ہے' جسے طبی ماہرین نے عصرِ حاضر میں دریافت کیا ہے۔ قرآن سے اس اصول کی وضاحت یوں ملتی ہے:

ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ السَّيِّئَةَ (۲۳/۹۶)۔

''بدی (مرض) کو اس (دوا) کے ساتھ دور کرو جو احسن (متوازن) ہو۔''

دوسری جگہ مزید وضاحت کی:

إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ (۱۱/۱۱۴)۔

''بے شک سیات (امراض) دور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ حسنات (ہمواریاں پیدا کرنے والے کام) کئے جائیں۔''

فلسفہ اخلاق کے محققین نے قرآنی صفحات میں الگ الگ بیان کی ہوئی حسنات (اقدار) کو قرآن سے تلاش کر کے سامنے لانے میں قابلِ قدر کاوشیں کی ہیں۔ خود راقم نے اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالہ میں مناسب رد و بدل کر کے کتاب بعنوان نظریہ خیر (فلسفہ اخلاق اور قرآن کی روشنی میں) مرتب کی ہے۔ اس میں بیشتر حسنات (اقدار) کی تفاصیل مختلف ابواب کے تحت مہیا کر دی ہیں' جن میں ان کا موازنہ حکمائے مغرب کے نظریات کو سامنے لا کر بھی کیا گیا ہے۔

قرآن میں درج توازن بدوش حسنات (اقدار) سے منافقت کے نفسیاتی مرض سے چھٹکارا حاصل کرنے کا علاج بیان کر دیا گیا ہے۔ مرض کی علامات/ صفات کا ذکر بھی کر دیا گیا ہے۔ علاج کا وہی معروف طریقہ ہے کہ سیات (توازن میں کمی بیشی کی

علامات) کی جگہ حسنات (توازن بدوش اقدار) کو لا کر توازن کو ٹھیک کیا جائے۔ اس نفسیاتی تبدیلی کے لئے قرآن کا اصول بھی بیان کر دیا گیا ہے کہ یہ خود مریض کی کاوشوں سے ہوگا۔

ان حسنات کی قرآن نے درج ذیل طرائق سے بھی وضاحت کی ہے۔

(۱) رسول اکرم ﷺ کی زندگی کو بطور اسوہ حسنٰی (ماڈل) کے طور پر پیش کر کے اس سے راہنمائی حاصل کرنے میں۔

قرآن کریم میں ہے کہ:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۳۳/۲۱)۔

''یقیناً تمہارے لئے اللہ کے رسول میں ایک توازن بدوش (حسنۃ) نمونہ ہے۔''

(۲) اجتماعی زندگی گذارنے کے لئے قرآن نے ضابطہ حیات (مستقل اقدار) کی نشاندہی کر دی ہے جن کی ایک نظام کے تحت اطاعت میں انسان اس نفسیاتی مرض سے شفا حاصل کرتا ہے۔ اس کی قرآن سے وضاحت ملتی ہے کہ:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءتْكُم مَّوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَشِفَاء لِّمَا فِي الصُّدُورِ (۱۰/۵۷)۔

''تمہارے رب کی طرف سے تمہارے لئے ضابطہ حیات آ گیا ہے۔ اس میں ہر نفسیاتی بیماری کا علاج ہے۔''

اسی لئے اسی ضابطہ حیات کے متعلق کہا ہے کہ:

هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ (۱۰/۵۸)۔

''یہ ہر اس شے سے بہتر ہے، جسے تم جمع کرتے رہتے ہو۔''

(۳) خارجی معیار میں اللہ کی صفات (الاسماء الحسنٰی) کو سامنے لا کر جو اپنے انتہائی نقطہ تکمیل یافتہ شکل میں ایسے تناسب و توازن سے سموئی ہوئی ہیں جس سے بہتر توازن تصور میں نہیں آ سکتا۔''

قرآن کریم میں ہے:

لَهُ الْأَسْمَاء الْحُسْنَى (۵۹/۲۴)۔

''صفات خداوندی اپنا پورا پورا توازن (حسن) لئے ذاتِ خداوندی میں مرکوز ہیں۔''

یہ صفات وہ قوتیں ہیں جو انسان کے اندر مضمر ہیں اور جن کی نشوونما بدرجہ اتم انسان کی زندگی کا مقصود اور منافقت کے روگ سے مکمل نجات ہے۔ اسی لئے ان کی بندگی کی طرف دعوت دی گئی ہے۔

صِبْغَةَ اللّهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّهِ صِبْغَةً وَنَحْنُ لَهُ عَابِدونَ (۲/۱۳۸)۔

''ہم نے قبول کرلیا رنگ (صفات) اللہ کا اور کس کا رنگ تو ازن بدوش (احسن) ہے اللہ کے رنگ سے اور ہم اسی کی بندگی کرتے ہیں۔''

ان مذکورہ توازن بدوش یعنی احسن اقدار کے معیار کو مقصودِ نظر رکھتے ہوئے' منافقت کے نفسیاتی مرض سے نہ صرف مکمل نجات حاصل ہو جاتی ہے بلکہ مستقبل میں اس بیماری میں مبتلا ہونے کی کوئی وجہ بھی باقی نہیں رہتی۔''

لہٰذا ہم سب کا اور خصوصی طور پر میڈیا کا فریضہ بنتا ہے کہ ہم ان اسماء الحسنٰی کے تحت زندگی گذارنے کی موثر انداز میں تلقین کرتے رہیں۔ یہ تبھی ممکن ہوسکتا ہے کہ پہلے ان صفات کو اپنے اندر منعکس کرنے کی ہر ممکن کوشش میں مصروف رہے۔ یہاں تک کہ ہم اس مقام پر پہنچ جائیں' جہاں:

وَلْتَنظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ (۱۸/۵۹)۔

''اور ہر نفس غور کرے کہ اس نے کل کے لئے کیا (حُسنِ عمل) آگے بھیجا ہے۔''

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(چھٹا باب)

سورۃ الفاتحۃ

(آیت 4: و ایاک نستعین)

عزیزانِ من! سابقہ درس سورۃ الفاتحہ کی چوتھی آیت کے پہلے ٹکڑے پر مشتمل تھا: اِیَّاکَ نَعْبُدُ (1:4) اور آج کا درس اس کے اگلے ٹکڑے پر مشتمل ہوگا: وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (1:4). ان الفاظ کا عام طور پر ترجمہ کیا جاتا ہے: ''ہم تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں''۔ یعنی اس پوری چوتھی آیت کا ترجمہ عام طور پر یہ کیا جاتا ہے کہ ''تیری ہی ہم پرستش کرتے ہیں اور تجھ ہی سے ہم مدد مانگتے ہیں'' پرستش والی بات کے متعلق تو میں سابقہ درس میں بتا چکا ہوں۔ اسی میں عبادت کے مفہوم سے اس آیت کے پہلے ٹکڑے کی وضاحت واضح ہوگئی تھی۔ اب یہ جو ''تجھ ہی سے ہم مدد مانگتے ہیں'' اس میں آپ دیکھیے کہ مدد کے لیے عربی زبان اور قرآنِ کریم میں بہت سے دوسرے الفاظ بھی آئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہاں اس لفظ کا انتخاب کیوں کیا گیا ہے۔

قرآنِ حکیم کے ایک ایک لفظ کا انتخاب بذات خود ایک ایسا اعجاز ہے کہ جس کا ترجمہ ممکن ہی نہیں

جیسا کہ میں بار بار بتاتا چلا آ رہا ہوں کہ عربی زبان بڑی وسیع المعانی ہے جس میں ایک ایک چیز کے لیے سینکڑوں الفاظ آتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے اپنے مقاصد اور مطالب کے اظہار کے لیے ان متعدد الفاظ میں سے جن کا انتخاب کیا ہے' وہ بذاتِ خود قرآن کا اعجاز ہے۔ اس لیے قرآن نے جس مقام پر جس لفظ کو استعمال کیا ہے' دیکھنا یہ ہوگا کہ اس نے وہاں اسی لفظ کو کیوں منتخب کیا ہے۔ اگر یہ حقیقت سامنے آ جائے تو نہ صرف یہ کہ اس سے متعلقہ آیت کا مفہوم واضح ہو جائے گا بلکہ اکثر و بیشتر قرآنِ کریم کی پوری کی پوری تعلیم یا اس کی غرض و غایت' حکمت کی ایک جھلک بھی' سامنے آ جائے گی۔ یہ وجہ ہے کہ قرآنِ کریم کے الفاظ کے صحیح مفہوم کا سمجھنا از بس ضروری ہے۔ ان الفاظ کے ترجمہ سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ پہلے بھی میں کہہ چکا ہوں ترجمہ تو ان الفاظ کا ہو ہی نہیں سکتا' دنیا کی کسی زبان میں بھی نہیں ہوسکتا۔

زیرِنظر آیت کے پہلے حصے میں اِیَّاکَ نَعْبُدُ (1:4) کہا گیا تھا۔ اس میں آپ نے دیکھ لیا تھا کہ عبدیت کے معنی

''اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کو ضابطہ خداوندی کے مطابق صرف کرنا ہے'' اور تعبیر کا لفظ بھی آپ کے سامنے آ گیا تھا جس کے معنی تھے ''ان صلاحیتوں کو نشوونما دینے کے بعد انہیں متعینہ قوانین اور قواعد وضوابط کے مطابق صرف کرنا' ان صلاحیتوں کی نشوونما کرنا اور اس کے بعد انہیں ان ساحلوں کے اندر رکھتے ہوئے' صرف کرنے سے نتیجہ نکالنا۔'' یہ ہم اس سے پہلے والے درس میں بتا چکے تھے۔ میں نے بتایا تھا کہ قرآن نے کہا ہے کہ یہ تمام چیزیں' تمہارے ایک مقصد کے بروئے کار لانے کے لیے ہیں' تمہارے فائدے کے لیے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس سے تمہاری منفعت کیا ہوگی؟ اس کے لیے کہا کہ اس سے تمہاری ذات کی نشوونما ہوگی اور اس میں اعتدال پیدا ہو جائے گا۔ میں نے کہا ہے کہ اس سے Developed and Balanced Personality (نشوونما یافتہ اور متوازن شخصیت) پیدا ہو جائے گی۔ ہر ایک فرد میں پیدا ہوگی اور ان افراد کے مجموعے سے جو نظام قائم ہوگا' وہ تمام عالمِ انسانیت کے لیے موجبِ فلاح و بہبود اور امن وسلامتی ہوگا۔ تو گویا اِیَّاکَ نَعْبُدُ (1:4) کے اندر یہ بات مضمر تھی کہ ہم اپنی صلاحیتوں کی نشوونما چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ انہیں تیرے قوانین کے تابع صرف کریں گے۔ اس صرف کرنے سے جو چیز پیدا ہوگی وہ اس آیت کے اگلے دو الفاظ: وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (1:4) میں ہے۔

سورۃ فاتحہ کے لفظ ''نستعین'' کی وضاحت

وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (1:4) میں ''نستعین'' کا مادہ ''ع ون'' ہے۔ عربی زبان ''عوان'' اس جانور یا انسان کو کہتے ہیں جو بھرپور شباب کے عالم میں ہو' اس کی توانائیاں نشوونما پا چکی ہوں' اس شرط کے ساتھ کہ ان میں پورا پورا اعتدال بھی ہو۔ لہٰذا اس ''استعان'' کے معنی ہوں گے: ''اپنی ذات کے لیے پوری پوری نشوونما اور اعتدال کی آرزو کرنا اور اس مقصد کے لیے کسی کی مدد طلب کرنا۔'' اسی نہج سے اللہ تعالیٰ کو المستعان (21:112) کہا گیا ہے۔ ''استعان'' کے اس مفہوم کے بعد جب ہم وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (1:4) کہتے ہیں' تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ''اے خدا! اے اللہ! ہم تجھ سے یہ چاہتے ہیں'' تو اس میں خدا سے چاہنا' طلب کرنا' اپنی آرزو کے پورا کرنے کے لیے اس سے کہنا' یہ تمام چیزیں اس استعان کے اندر آ جائیں گی۔ اس سے آپ دیکھیے گا کہ فوراً آپ کے ذہن میں ''دعا'' کا لفظ آئے گا' دعا کا تصور آئے گا کہ ہم خدا سے ''دعا'' کرتے ہیں کہ ہم ایسے ہو جائیں۔

نستعین کے مفہوم سے پہلے لفظ دعا کی وضاحت کرنا ضروری ہے

جب تک دعا کا مفہوم سمجھ میں نہیں آئے گا اس وقت تک نہ صرف یہ کہ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (1:4) کا مفہوم سمجھ میں

نہیں آئے گا بلکہ قرآنِ کریم کی یوں کہیے کہ پوری کی پوری تعلیم سمجھ میں نہیں آئے گی۔ اس کے متعلق عجیب قسم کے الجھاؤ پیدا ہوں گے، بعض اوقات کشمکش بھی پیدا ہوگی۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں سب سے پہلے دعا کا قرآنی مفہوم سمجھ لینا چاہیے۔ ممکن ہے میرے کہنے سے آپ احباب میں سے بعض کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ ان میں سے کون ہے جو ''دعا'' کو نہیں سمجھتا، دعا تو ہم ہر روز خدا سے مانگتے ہیں، یہ وہ لفظ ہے جو اللہ کے ساتھ بار بار ہمارے ذہنوں میں، ہماری زبان پہ آتا ہے تو پھر اس کے لیے اتنی لمبی وضاحت کی کیا ضرورت ہے لیکن عزیزانِ من! جیسا کہ آپ پہلے دیکھ چکے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ جتنے بھی الفاظ اور اصطلاحات اس سے پہلے آئی ہیں، ان سب میں یہ بات تھی کہ ہمارے ذہنوں میں اس کے متعلق پہلے سے ایک مفہوم یا ایک تصور متعین تھا لیکن جب عربی زبان اور قرآنِ کریم کی رو سے اس کی وضاحت ہوئی تو یہ نظر آیا کہ ہمارا وہ تصور، نہ تو مفہوم کے اعتبار سے، نہ اسی زبان کے اعتبار سے صحیح تھا اور نہ ہی قرآن کی تعلیم کے اعتبار سے۔ ان تصورات میں ایک تبدیلی پیدا ہوئی، ایک انقلاب آیا اور اسی طرح سے آپ دیکھیں گے کہ جب ''دعا'' کا قرآنی مفہوم سامنے آئے گا تو اس سے بھی آپ کے قلب و نگاہ کے اندر ایک انقلاب پیدا ہو جائے گا۔

ہمارے ہاں ''دعا'' مانگنے سے عام مفہوم یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے کسی مقصد کے حصول کے لیے بارگاہِ خداوندی میں التجا کرتا ہے۔ اسی کو خدا کے ہاں سے مراد مانگنا بھی کہا جاتا ہے۔ دعا کے اس مفہوم کے خلاف جو شکوک پیدا ہوتے ہیں اور جو اعتراضات اُبھرتے ہیں، میں پہلے انہیں سامنے لانا چاہتا ہوں۔ میں اتنا واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ دعا کے تصور یا مسئلہ کا تعلق تقدیر سے بھی ہے۔ اسے میں نے اپنی تصنیف ''کتاب التقدیر'' [1] میں بھی تفصیل سے لکھا ہے اور پھر جستہ جستہ مقامات پر ''مطالب الفرقان'' [2] کی اب تک چھپنے والی کتب میں بھی، اس کی بعض تفاصیل آئی ہیں لیکن اس درس میں چونکہ یہ بات پہلی دفعہ آئی ہے، اس لیے جو کچھ میں نے وہاں تفصیل سے لکھا ہے، اسے یہاں سمیٹ کر، ملخصاً، آپ کے سامنے پیش کروں گا۔

---

[1] کتاب التقدیر کا پہلا ایڈیشن اکتوبر 1971ء کو زیورِ طباعت سے آراستہ و پیراستہ ہو کر منظرِ عام پر آیا۔ اس میں ''خدا کا تصور'' کے لیے دیکھیے ص ص 35 تا 51، اور ''دعا'' کے لیے دیکھیے ص ص 359 تا 390 ''کتاب التقدیر'' میں دنیا کے مشکل ترین مسئلہ کا، قابلِ فہم، بصیرت افروز، حل موجود ہے۔

[2] اس سے مراد ''مطالب الفرقان'' کی پہلی 6 جلدیں سورۃ فاتحہ سے سورۃ ہود تک پرویزؒ (1903-1985) کی حیات میں ہی طبع ہو کر منظرِ عام پر آ چکی تھیں جبکہ اس سلسلہ کی ساتویں جلد جو سورۃ حجر تک کا مسودہ آپ کی زندگی میں ہی اکتوبر 1984ء میں بستر علالت پر فراش ہونے سے قبل مکمل ہو چکا تھا جو بعد میں پھر 1991ء میں شائع ہوا۔

لفظ دعا کے متعلق عام طور پر پایا جانے والا تصور اور اس سے پیدا ہونے والی صورتِ حال

میں نے ابھی ابھی یہ کہا ہے کہ جب دعا کا یہ مفہوم لیا جائے کہ ہم خدا سے کچھ مانگتے ہیں' کچھ چاہتے ہیں کہ وہ ہماری یہ طلب پوری کر دے تو اس کے خلاف کچھ شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ کچھ اعتراضات ابھرتے ہیں' سب سے پہلے میں انہیں سامنے لاتا ہوں۔ اگر عقیدہ یہ ہو کہ انسان کی زندگی میں جو کچھ ہونا ہے' اسے خدا نے پہلے سے لکھ دیا ہوتا ہے اور یہ قسمت کا لکھا اٹل ہوتا ہے تو پھر دعا کے کچھ معنی ہی نہیں رہتے۔ مثلاً ایک شخص کے متعلق اگر پہلے سے طے شدہ ہے کہ اس نے اتنے دن بیمار رہ کر مر جانا ہے' اب اس کے لیے وہ خود' یا اس کے متعلقین لاکھ دوائیں کریں' قسمت کے لکھے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ اس لیے کہ قسمت کے لکھے کے متعلق بھی تو عقیدہ یہ ہے کہ وہ خدا ہی کا طے کردہ' خدا ہی کا فیصلہ ہوتا ہے' خدا ہی نے تقدیر مقرر کی ہے' خدا ہی نے اس کی قسمت میں یہ لکھا ہے۔ اگر قسمت میں یہی لکھا ہے کہ ایک شخص اتنا بیمار رہے گا اور اس کے بعد مر جائے گا' تو پھر دوا کرنے سے کیا حاصل ہوگا اور اگر یہ کہا جائے کہ نہیں' دعا سے تقدیر بدل جاتی ہے تو پھر یہ عقیدہ غلط قرار پائے گا کہ قسمت کا لکھا اٹل ہوتا ہے۔ جو فیصلہ بدل سکتا ہے خواہ وہ دعا سے بدلے یا تدبیر سے' وہ اٹل نہیں کہلا سکتا اور اس کے ساتھ ہی اس عقیدہ کی رو سے خود اللہ تعالیٰ کے متعلق بھی عجیب سا تصور سامنے آتا ہے کہ پہلے اس نے ایک بات کا فیصلہ کر دیا اور کہہ دیا کہ ہمارا یہ فیصلہ اٹل ہے۔ اس کے بعد وہ انتظار کرنے لگا کہ اگر اس شخص نے یا اس کے متعلقین نے ہم سے درخواست کی' تو ہم اپنا فیصلہ بدل دیں گے اور اگر یہ خاموش رہے تو وہ فیصلہ نافذ ہو جائے گا۔ سوچیے' عزیزانِ من! کہ خدا کے متعلق اس قسم کے تصور سے کس قسم کے اشکال پیدا ہوتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ پہلے سے ہر بات طے شدہ نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ ہر معاملہ کا فیصلہ ساتھ کے ساتھ کرتا ہے تو اس سے اور بھی زیادہ پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔

عزیزانِ من! اس کی وضاحت ایک مثال سے کی جاتی ہے۔ مثلاً زید اور بکر کا باہمی مقدمہ ہے جس کا فیصلہ عدالت نے کرنا ہے۔ زید حق پر ہے اور بکر جھوٹا ہے۔ دونوں خدا سے دعا کرتے ہیں کہ فیصلہ اس کے حق میں ہو جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ ان دونوں کی دعا قبول نہیں ہوسکتی کیونکہ مقدمہ کا فیصلہ لامحالہ ایک ہی کے حق میں ہوسکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان دونوں میں سے کس کی دعا قبول ہوگی۔ اگر کہا جائے کہ اس کی دعا قبول ہوگی جو زیادہ گڑگڑا کر دعا مانگے گا تو ہوسکتا ہے کہ بکر جو جھوٹا تھا' وہ زیادہ خشوع وخضوع سے دعا مانگے۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ خدا اس کی دعا قبول کرے گا خواہ وہ حق پر نہ ہی ہو۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ نہیں' خدا اس کی دعا قبول کرے گا جو حق پر ہے یعنی زید کی تو اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر زید دعا نہ مانگتا تو پھر کیا ہوتا۔ پھر خدا بکر کا ساتھ دیتا کیونکہ اس نے دعا مانگی تھی اور زید نے دعا نہیں مانگی تھی۔ اس لیے اس نے اس کا

ساتھ نہیں دیا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ کس قسم کے اعتراضات وارد ہو رہے ہیں اور اگر کہا جائے کہ خدا بہرحال حق بات کا ساتھ دے گا تو اول تو یہ چیز واقعہ کے خلاف ہے' ہمارے ہاں عدالتوں سے آئے دن ایسے فیصلے صادر ہوتے رہتے ہیں جو حق کے خلاف ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ کئی بے گناہ پھانسی کے تختے پر چڑھا دیئے جاتے ہیں لیکن اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے کہ خدا حق کا ساتھ دیتا ہے تو اس صورت میں دعا کا پھر کوئی مطلب نہیں رہتا۔ حقدار دعا کرے یا نہ کرے' خدا بہرحال اس کا ساتھ دے گا اور جو حق پر نہیں وہ لاکھ دعائیں کرے' خدا اس کی سنے گا ہی نہیں۔

دعا کے ساتھ تدبر کا عمل بھی

عزیزانِ من! اگر کہا جائے کہ خالی دعا نہیں بلکہ دعا کے ساتھ تدبیر بھی ضروری ہے اور دعا سے تدابیر کامیاب ہو جاتی ہیں تو اس سے پھر اور دشواری لاحق ہو جاتی ہے۔ مثلاً زید اور بکر دونوں تدبیر کرتے ہیں۔ بکر اس کے ساتھ دعا بھی کرتا ہے اور زید دعا نہیں کرتا تو کیا اس صورت میں بکر کی تدبیر کارگر ہو جائے گی کیونکہ اس نے دعا بھی کی تھی اور زید ناکام رہ جائے گا کیونکہ اس نے دعا نہیں کی تھی۔ یہ ہیں وہ اشکال جو ہمارے ہاں کے مروّجہ عقائد کی رو سے دعا کے سلسلے میں ذہنوں میں ابھرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمارے سامنے سورۂ بقرہ کی وہ آیت آتی ہے جسے دعا اور اس کی قبولیت کے ضمن میں بنیادی طور پر پیش کیا جاتا ہے لیکن جس کا غلط مفہوم ان دشواریوں میں اور بھی اضافہ کر دیتا ہے۔

سورہ بقرہ کی آیت نمبر 2.186 کا مروجہ ترجمہ اور اس سے پیدا ہونے والی دشواری

اگر آپ کے پاس قرآنِ کریم کا نسخہ ہے' تو آپ اس آیت کو خود سامنے لے آیئے۔ وہ آیت ہے: وَاِذَا سَأَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ط اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (2:186)۔ اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ ''اے رسول! جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو ان سے کہہ دو کہ میں ان کے قریب ہوں۔ جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار کو سنتا اور اسے قبول کرتا ہوں۔'' اس ترجمہ کی رو سے دشواری یہ پیش آتی ہے کہ ہم روز دیکھتے ہیں کہ مظلوم و مقہور' غریب و نادار' بے کس و بے بس' اور مصیبت زدہ لوگ' دن رات گڑگڑا کر خدا سے دعائیں مانگتے ہیں لیکن ان کی مصیبت رفع نہیں ہوتی' ان کی ساری عمر ظلم و ستم سہتے' مصیبتوں میں' کٹ جاتی ہے۔ لہٰذا اس امر واقع کی موجودگی میں یہ کس طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ خدا ہر پکارنے والے کی پکار سنتا اور اس کی دعا قبول کرتا ہے۔ اس اعتراض کے جواب میں عام طور پر کہہ دیا جاتا ہے کہ اللہ سنتا تو سب کی ہے لیکن کرتا وہی ہے جو دعا مانگنے والے کے حق میں

بہتر ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر کسی کی دعا قبول نہیں ہوتی تو اسے سمجھ لینا چاہیے کہ جو کچھ ہوا ہے اس کے حق میں وہی بہتر تھا لیکن قطع نظر اس کے کہ ستم رسیدہ، مصیبت زدہ، برسرِحق، مظلوم انسان کا اس سے حقیقی اطمینان نہیں ہوسکتا، بڑے دوررس نتائج کا موجب بن جاتا ہے۔ ایک مظلوم انسان، ظالم کی دست درازیوں کے خلاف خدا سے دعا کرتا ہے اور اس کے بعد دیکھتا ہے کہ اس کی حالت ذرا بھی بہتر نہیں ہوئی بلکہ اس مستبد ظالم کے ظلم میں اور اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے تو مذکورہ بالا جواب کی رو سے اسے سمجھ لینا چاہیے کہ ظالم کا ظلم اس کے حق میں بہتر اور خدا کی منشا کے عین مطابق ہے، اس لیے اسے نہ اب اس کے مظالم کے خلاف لب کشائی کرنا چاہیے اور نہ ہی اس سے بچنے کی کوئی تدبیر سوچنا چاہیے۔

اس قسم کی غلط سوچ کا نتیجہ

غور کیجیے کہ اس قسم کے عقائد ظالموں کو کس طرح بدلگام چھوڑ دینے کا موجب بن جاتے ہیں۔ اس سے پہلے ان ظالموں کے خلاف مظلوموں کے دل میں کم از کم انتقام کے جذبات تو ابھرتے تھے اور ہوسکتا تھا کہ وہ ان کے دست ستم سے محفوظ رہنے کی کوئی تدبیر سوچ لیتے لیکن اس عقیدہ کے بعد تو صورت یہ ہوگی کہ مظلوم نہ صرف ظلم و زیادتی کو دل کے پورے سکون کے ساتھ برداشت کرے گا بلکہ ظالم کے حق میں دعائے خیر بھی کرے گا کہ وہ اس کے لیے بہتری کے سامان پیدا کر رہا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ مستبد قوتیں، محکوموں، زیردستوں اور مظلوموں کے لیے کس کس قسم کے عقائد وضع کرتی رہتی ہیں تاکہ وہ انہیں ذبح بھی کریں اور یہ ان کے شکرگزار بھی ہوں۔

دعا کی قبولیت کے لیے خدا کے مقرب بندوں کے وسیلے کی تلاش

عزیزانِ من! اس سے بھی آگے بڑھیے تو یہ عقیدہ سامنے آتا ہے کہ خدا ہر ایک کی نہیں سنتا، وہ اپنے مقبول بندوں کی دعائیں قبول کرتا ہے۔ اس عقیدے کا نتیجہ ہے کہ آپ کو ہر حضرت صاحب کے آستانۂ عالیہ پر مصیبت زدہ اور آفت رسیدہ لوگوں کا ہجوم دکھائی دیتا ہے جو گڑگڑا کر ہاتھ باندھے اور اکثر ان کے پاؤں چومتے درخواست کرتے ہیں کہ یا حضرت! میرے لیے دعا کیجیے، ورنہ میں تباہ ہوجاؤں گا، برباد ہوجاؤ گا اور یہ سلسلہ حضرت صاحب کی زندگی تک ہی محدود نہیں رہتا، ان کی وفات کے بعد جسے یہ لوگ وفات نہیں بلکہ وصال کہتے ہیں، یعنی ان کا اپنے محبوب، خدا کے ساتھ جا کر مل جانا، تو ان کی وفات کے بعد، ان کے مزار شریف سے وابستہ ہوجاتا ہے، جہاں ان سے سجدوں میں گرگر کر التجائیں کی جاتی ہیں اور مرادیں مانگی جاتی ہیں۔ جب ان سے پوچھا جائے تو جواب میں کہا جاتا ہے کہ ہم گنہگار بندے ہیں، اس لیے ہماری خدا تک رسائی نہیں ہوسکتی، یہ حضرات مقربین بارگاہِ خداوندی ہیں، اس لیے خدا ان کی بات مانتا ہے۔ یہ عقیدہ بھی رکھا جاتا ہے اور اس کے

ساتھ قرآن کی وہ آیت بھی پڑھی جاتی ہے' جسے میں نے شروع میں بیان کیا ہے یعنی وَاِذَا سَأَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ط اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (2:186) جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو ان سے کہہ دو کہ میں ان کے قریب ہوں' میں ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ خدا کے مقربین کی وساطت سے خدا تک درخواست پہنچانے کا یہ عقیدہ' ہمارے دورِ ملوکیت کی تخلیق ہے۔ اس دور میں ذہنوں میں یہ بٹھایا گیا کہ **السلطان ظل اللہ علی الارض** یعنی بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس قسم کا سایہ زمین پر دیکھا گیا اسی قسم کی اس کی اصل آسمان پر تصور کر لی گئی۔ اس کی رو سے' خدا کا جو تصور سامنے آتا ہے' ظاہر ہے یہاں کے بادشاہوں کی طرح' وہ شہنشاہ حقیقی بھی ایک آمرِ مطلق سمجھا جاتا ہے' نہ کسی قاعدے کا پابند' نہ قانون کا: جسے چاہا پکڑ لیا' جسے چاہا نواز دیا، جسے چاہا بخش دیا' جسے چاہا باندھ لیا۔

اسی سلسلے میں بادشاہ کا دربار سامنے آیا جس میں سب سے پہلے حارس اور دربان کھڑے ملتے تھے' پھر اہل دربار میں سے مصاحب' امراء' وزراء اور پھر مقربین بارگاہِ سلطانیہ سامنے آتے تھے۔ کسی عام آدمی کے لیے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اپنی درخواست براہِ راست سلطان المعظم تک پہنچا سکے۔ اس کے لیے اسے مقربین کے وسیلے کی ضرورت پڑتی تھی۔ آج بھی یہی حالت ہے۔ دفتروں کے باہر بیٹھے ہوئے چپڑاسی (Peons) ہی ذریعے بنتے ہیں جس سے درخواست آگے جاتی ہے۔ بہرحال دورِ ملوکیت میں بادشاہ اور بادشاہ کے دربار کا اس قسم کا جو تصور سامنے آیا تو ہم نے یہی نقشہ دربارِ خداوندی کا متعین کر دیا۔ اس کی رو سے خدا تک بات پہنچانے کے لیے اس کے مقربین کی وساطت ضروری قرار پائی۔ یہ ہے وہ ضرورت جس کے پیشِ نظر خدا تک دعا پہنچانے کے لیے کسی حضرت صاحب کے وسیلے کی تلاش ہوتی ہے۔ وہ ہماری درخواست بھی خدا تک پہنچاتے ہیں اور اس کے ساتھ سفارش بھی کرتے ہیں۔ اللہ ان کی بات مان لیتا ہے اور ہماری درخواست منظور ہو جاتی ہے۔ درخواست کے ساتھ کچھ نذر نیاز بھی دینی پڑتی ہے' بعینہٖ بادشاہوں کے حضور نذرانے گزارنا پڑتے ہیں یا ان کے مقربین کی خدمت کرنا پڑتی ہے۔

خدا کے متعلق ہمارا موجودہ تصور دورِ ملوکیت کا اور مرورِ زمانہ کا پیدا کردہ ہے

یہ ہے عزیزانِ من! خدا کا وہ تصور جو ہمارے شہنشاہیت کے زمانے میں' ہمارے ذہنوں میں مرتسم کیا گیا اور جس نے رفتہ رفتہ مصدقہ عقائد کی شکل اختیار کر لی۔ مرورِ زمانہ کے یہ عقائد اس طرح ہمارے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہو گئے کہ اب اگر ان کے خلاف کوئی بات کہی جائے' تو اربابِ شریعت کی طرف سے اس پر کفر و الحاد کے فتوے لگا دیئے جاتے ہیں اور

دامانِ طریقت کے وابستہ افراد پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے کہ نہ معلوم حضرت صاحب کی طرف سے کیسا غضب نازل ہو جائے گا حالانکہ ان حضرات کے متعلق اللہ کا ارشاد ہے کہ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ (7:194) وہ تمہارے ہی جیسے انسان' خدا کے بندے ہیں۔ اور جن مزاروں پر جا کر مرادیں مانگی جاتی ہیں یا انہیں خدا تک بات پہنچانے کا واسطہ قرار دیا جاتا ہے' ان کے متعلق کہا کہ تم انہیں لاکھ پکارو' وہ تمہاری بات ہی نہیں سن سکتے اور اگر بالفرض محال وہ سن بھی لیں تو اس کا جواب ہی نہیں دے سکتے (35:14)۔ تم انہیں جو کچھ پکار پکار کر کہتے ہو وہ اس سے قطعاً بے خبر ہوتے ہیں (46:5)۔ انہیں تو خود اپنے متعلق بھی اتنا علم نہیں ہوتا کہ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ (16:21) وہ کب اٹھائے جائیں گے۔ جو اپنے حال سے بھی بے خبر ہیں' وہ تمہاری کیا سنیں گے اور تمہاری کیا مدد کریں گے!!

دعا کے اس پیچیدہ مسئلے کا ایک نہایت شافی اور متضاد کیفیات سے ماوراحل

اب آیئے اس سوال کی طرف کہ دعائیں قبول کن لوگوں کی ہوتی ہیں اور کس طرح ہوتی ہیں۔ سب سے پہلے اسی آیت کو لیجیے جس کا ایک حصہ ہم پہلے نقل کر چکے ہیں اور اس کی وضاحت میں' میں نے اتنا کچھ کہا ہے یعنی وہ آیت جس کے معنی تھے کہ جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو ان سے کہو کہ میں ان کے قریب ہوں' ہر پکارنے والی کی پکار کا جواب دیتا ہوں' اس کے بعد ہے کہ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ (2:186) ان سے کہو کہ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری مانگ پوری ہو' تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم میری راہنمائی' میرے قوانین کی صداقت پر' پورا پورا یقین رکھو اور میری اطاعت کرو' میری باتوں کا جواب دو' اس طرح کامیابی کا صحیح راستہ تمہارے سامنے آ جائے گا۔ تم اسے یہ کہتے ہو کہ میں تمہاری بات کا جواب دوں تو خدا سے یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ میں تمہاری بات کا جواب دوں' لیکن پہلے تم میری باتوں کا تو جواب دو۔

دعا کی قبولیت کے سلسلہ میں قرآن کا تفصیلی جواب

یعنی وہ یہ کہ میں نے جو کچھ تم سے کہا تھا' بتاؤ تم نے ان کے متعلق کیا کیا۔ کیا ان پر عمل کیا؟ کیا اس کے مطابق چلے؟ پہلے اس بات کا جواب دو تو پھر میں تمہاری بات کا جواب دوں گا۔ غور فرمایا' عزیزانِ من! اسی کی وضاحت میں دوسری جگہ کہا کہ يَسْتَجِيْبُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (42:26) دعائیں قبول ان کی ہوتی ہیں جو ایمان لائیں اور اعمالِ صالحہ کریں یعنی ایمان و اعمالِ صالحہ کا لازمی اور فطری نتیجہ کامیابی ہوتا ہے اور یہی دعا سے مقصود ہوتا ہے۔ ایک دوسرے مقام پر سورۃ المؤمن میں ہے کہ تم مجھے پکارو' میں تمہاری پکار کا جواب دوں گا لیکن اتنی بات سن رکھو کہ اِنَّ الَّذِيْنَ

یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِیْنَ (40:60) جولوگ میری اطاعت سے سرکشی اختیار کریں گے' ان کی دعائیں قبول نہیں ہوں گی' وہ ذلیل وخوار ہوکر جہنم میں داخل ہوں گے۔

جو کچھ میں نے ابھی تک جستہ جستہ مقامات سے کہا ہے' سورۂ آل عمران کی تین چار مسلسل آیتوں میں اسے نہایت وضاحت سے' تسلسل کے ساتھ' بیان کیا گیا ہے۔ پہلی آیت (3:189) ہے۔ میں آیت قرآنِ کریم سے پڑھتا ہوں اور اس آیت کا مفہوم اپنے ''مفہوم القرآن'' سے آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں نے پورے قرآنِ کریم کا مفہوم مرتب کیا ہوا ہے' اس کا نام بھی ''مفہوم القرآن'' ہے۔ تو یہ جو آیت میں پیش کروں گا' اس کا مفہوم' مفہوم القرآن ہی سے پیش کروں گا۔ آیت یہ ہے اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَاخْتِلٰفِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ (3:190) جولوگ عقل وبصیرت سے کام لیتے ہیں' ان کے لیے کائنات کی تخلیق' رات اور دن کی گردش میں قوانین خداوندی کی محکمیت اور ہمہ گیریت کی نشانیاں ہیں الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَ یَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ج رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ج سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (3:191) ان صاحبانِ عقل وبصیرت اور اربابِ فکر ونظر کے لیے' جو زندگی کے ہر گوشے میں کھڑے' بیٹھے' لیٹے' قوانین خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں اور کائنات کے تخلیقی پروگرام پر غور وفکر کرتے رہتے ہیں' اور اپنی تحقیقات کے بعد علیٰ وجہ البصیرت پکار اٹھتے ہیں' کہ اے ہمارے نشو ونما دینے والے! تو نے اس کارگہۂ ہستی کو نہ تو عبث اور بیکار پیدا کیا ہے اور نہ ہی تخریبی نتائج مرتب کرنے کے لیے۔ تیری ذات اس سے بہت بلند ہے کہ تو کسی شے کو بے مقصد اور بلاغرض وغایت پیدا کردے۔ تو ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم علمی تحقیقات اور عملی تجارب کے بعد اشیائے کائنات سے صحیح صحیح فائدہ اٹھائیں اور اس طرح تباہ کن عذاب سے محفوظ رہیں۔ اب یہ ہے کہ رَبَّنَآ اِنَّکَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَهٗ ط وَ مَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ (3:192) جو قومیں اس قسم کی تحقیقات نہ کرنے سے' اشیائے کائنات کی نفع بخشیوں سے محروم رہتی ہیں' ان کی سعی وعمل کی کھیتیاں جھلس جاتی ہیں اور وہ ذلت وخواری کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی ذلیل وخوار قوموں کا کوئی یار و مددگار نہیں ہوتا لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں دنیا کی تباہی کے لیے استعمال نہ کیا جائے بلکہ نوع انسان کی ربوبیت عامہ کے لیے صرف میں لایا جائے۔ ایسا کچھ وہی قوم کر سکتی ہے جو خدا کی رہنمائی پر یقین محکم رکھے۔ لہٰذا ان اربابِ عقل وبصیرت کی پکار یہ ہوتی ہے کہ رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا

يُّنَادِىْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا صلے ق رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَ تَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ (3:193) اے ہمارے نشو ونما دینے والے! ہم نے ایک پکارنے والے کو یہ کہتے سنا کہ "آؤ! اپنے نشو ونما دینے والے کے قانون کی صداقت پر ایمان لاؤ" ہم نے اس کی دعوت پر لبیک کہا' اور خدا کے قانون کی صداقت پر ایمان لے آئے۔ اس کے بعد ان اربابِ علم وایمان کے سینے میں اس قسم کی آرزوئیں بیدار ہوتی ہیں کہ اے ہمارے نشو ونما دینے والے! ہم سے اگر کوئی بھول چوک ہو جائے تو اس کے مضرت رساں نتائج سے ہمیں محفوظ رکھنا اور ہماری چھوٹی چھوٹی کوتاہیوں اور تدبیری ناہمواریوں کے اثرات مٹاتے رہنا۔ اور ہمارا انجام ان لوگوں کی رفاقت میں کرنا' جن کے سامنے زندگی کی وسعت اور کشادگی کی راہیں کھل چکی ہوں۔ اگلی آیت ہے کہ رَبَّنَا وَ اٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَ لَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ط اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ (3:194) اے ہمارے نشو ونما دینے والے! تو نے ہم سے اپنے رسولوں کے ذریعے' وحی کی رو سے' جن خوشگواریوں اور سرفرازیوں کا وعدہ کیا ہے' ان سے ہمیں بہرہ یاب کرنا۔ اور ایسا نہ کرنا کہ اعمال کے ظہورِ نتائج کے وقت ہم دنیا کی نگاہوں میں ذلیل وخوار ہو جائیں۔ ہمیں یقین ہے کہ تو وعدہ خلافی نہیں کیا کرتا۔ تیرا ہر قانون صحیح صحیح نتائج مرتب کر کے رہتا ہے۔

عزیزانِ من! دعائیں مانگنے والوں کی خصوصیات کو بھی آپ نے دیکھ لیا اور ان کی دعاؤں کو بھی۔ اب خدا کی طرف سے اس کا جواب سنیے۔ جواب یہ ہے کہ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّىْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى (3:195) خدا نے ان کی دعاؤں کا یہ جواب دیا کہ ہم نے تمہاری دعاؤں کو سن لیا ہے لیکن تم یاد رکھو! ہم کسی کام کرنے والے کی محنت کو ضائع نہیں کرتے' وہ مرد ہو یا عورت' ہر ایک کو اس کے عمل کا پورا پورا بدلہ دیتے ہیں۔ یہ ہوتا ہے' عزیزانِ من! خدا کی طرف سے دعاؤں کا جواب اور ان کی قبولیت کی شرط۔

مومنین کی دعاؤں کی قبولیت کے بعد انبیائے کرام کی دعاؤں کی قبولیت کی نوعیت اور غایت

یہاں تک تو بات عام مومنین کی تھی۔ حضراتِ انبیائے کرامؑ کی دعاؤں کی قبولیت کی صورت بھی ملاحظہ فرماؤ کہ ان کی قبولیت کو خدا کن باتوں سے مشروط قرار دیتا ہے اور وہ کس طرح سے قبول ہوتی ہیں۔ دو تین مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔ حضرتِ نوحؑ کے متعلق' جب ان کی قوم نے ان کی سخت مخالفت کی تو کہا کہ وَ لَقَدْ نَادٰنَا (37:75) نوحؑ نے ہمیں پکارا اور اس کے بعد ہے کہ فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ (37:75) اور ہم دعاؤں کا بہترین جواب دینے والے ہیں۔ ان کی اس دعا کا جواب

کیا دیا گیا۔ ذرا غور سے سنیے' جواب تھا کہ فَاَوْحَیْنَآ اِلَیْہِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْکَ بِاَعْیُنِنَا وَ وَحْیِنَا (23:27) ہم نے نوحؑ کی طرف وحی بھیجی۔ اس سے کہا کہ تم اس آنے والے طوفان سے بچنا چاہتے ہو' حفاظت چاہتے ہو' اس کے لیے تم نے ہمیں پکارا تھا اور اس پکار کا جواب ہم تمھیں دیتے ہیں۔ اور وہ جواب یہ ہے کہ تم ایک کشتی بناؤ۔ ہوسکتا ہے تم کہو کہ یہ ایک نئی سی چیز ہے' مجھے کشتی بنانی نہیں آتی' ہم بتائیں گے کہ کشتی کیسے بنائی جاتی ہے' ہمارے زیرنگرانی کشتی بناؤ' ہماری وحی کے مطابق کشتی بناؤ لیکن کشتی بناؤ۔ اس طوفان سے حفاظت کی صورت یہی ہے کہ تم کشتی بناؤ' کشتی کے ذریعے سے حفاظت ہوگی۔ آپ دیکھ رہے ہیں' عزیزانِ من! نوحؑ نے پکارا۔ جواب ملا کہ فَلَنِعْمَ الْمُجِیْبُوْنَ (37:75) ہم بہترین دعاؤں کا جواب دینے والے ہیں اور جواب یہ دیا گیا کہ طوفان سے بچنا ہے تو اس کے لیے کشتی بناؤ۔

حضرت نوح کے بعد حضرت موسیٰ کا ذکرِ خیر اور پروگرام کی تکمیل کے لیے استقامت کی تاکید

آگے بڑھیے۔ جب حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا کہ فرعون [1] کی طرف جائیں اور بنی اسرائیل کو اس کے پنجۂ استبداد سے نجات دلائیں تو انہوں نے اس مہم کی سختی اور اس میں پیش آنے والے خطرات کے احساس سے خدا سے متعدد تائیدی اسباب وذرائع کی دعا کی تاکہ وہ ان کی تقویت کا موجب بنیں۔ حضرتِ موسیٰؑ نے خدا سے یہ کچھ مانگا' اس کے جواب میں کہا کہ قَدْ اُوْتِیْتَ سُؤْلَکَ یٰمُوْسٰی (20:36) اے موسیٰؑ! جو کچھ تم نے مانگا ہے' تجھے عطا کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب خدا نے اس طرح کہہ دیا ہو کہ ہم نے تیری دعا قبول کر لی' تیری مانگ پوری کر دی' تو پھر کچھ کرنے کی ضرورت باقی ہی نہیں رہ سکتی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی ان سے کہہ دیا کہ اِذْھَبْ اَنْتَ وَ اَخُوْکَ بِاٰیٰتِیْ وَ لَا تَنِیَا فِیْ ذِکْرِیْ (20:42) تم دونوں بھائی موسیٰؑ اور ان کے بھائی حضرت ہارونؑ فرعون کی طرف جاؤ اور یاد رکھو' جو پروگرام تمہیں دیا گیا ہے' اس کے بروئے کار لانے میں ذرا سی بھی سستی نہ کرنا۔ دعا کے قبول ہو جانے کی ضمانت بھی دی اور اس کے بعد یہ کہا کہ اسے تم نے بروئے کار لانا ہے اور اس میں ذرا سا بھی تغافل نہ برتنا' تساہل نہ کرنا۔ دوسری جگہ ہے کہ قَالَ قَدْ اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُکُمَا فَاسْتَقِیْمَا وَ لَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِیْلَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ (10:89) خدا نے کہا کہ میں نے تمہاری دعا کو قبول کر لیا: فَاسْتَقِیْمَا اب تم اس پروگرام پر جم کر کھڑے ہو جاؤ اور یاد رکھو' کبھی ان لوگوں کا اتباع نہ کرنا جو حقیقت کا علم نہیں رکھتے۔

---

[1] فرعون کے متعلق دیکھیے: مطالب الفرقان فی دروس القرآن' سورۃ بنی اسرائیل۔ ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2004' ص 109 (فٹ نوٹ 1)

غور فرمائیے' عزیزانِ من! ایک نبی سے کہا جارہا ہے کہ تمہاری دعا ہم نے قبول کرلی اور اس قبولیت کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ جو پروگرام تمہیں دیا جاتا ہے اس پر جم کر کھڑے ہو جانا' تمہارے پائے استقامت میں ذرا لغزش نہ آنے پائے اور اس کے بعد تم دیکھو گے کہ تمہیں کامیابی نصیب ہو جاتی ہے۔ یعنی فقط ان کی کامیابی نہیں ہوسکتی یہ پروگرام ہے جس پر عمل کرنا ہے اور نہایت استقامت سے اس پر عمل پیرا ہونا ہے۔

جن لوگوں کی دعائیں قبول نہیں ہوتیں ان کی عملی زندگی کی حالت

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا' عزیزانِ من! کہ جن دعاؤں کے متعلق یہ کہہ دیا گیا کہ ہم نے انہیں قبول کر لیا' ان کے سلسلوں میں بھی یہ تاکید کر دی کہ ان کی کامیابی کے لیے جن طبعی اسباب و ذرائع کی ضرورت ہے' انہیں باہم پہنچایا جائے اور اپنے پروگرام پر ثبات و استقامت سے عمل پیرا ہوا جائے' یہ نہیں کہ دعا مانگ لی' خدا نے جواب دیا کہ ہم نے قبول کر لی اور پھر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے۔ اس قسم کی دعاؤں کے متعلق سورۂ رعد میں کہا گیا ہے اور بڑے ہی محاکاتی انداز سے کہا گیا ہے کہ تم ذرا اس پیاسے کا تصور سامنے لاؤ جو اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے دریا کے کنارے کھڑا ہے۔ کیا اس شخص کی پیاس بجھ جائے گی؟ اس کی پیاس کبھی نہیں بجھے گی۔ جو آگے بڑھ کر پانی سے چلو بھرے اور اسے پی لے' پیاس اس کی بجھے گی۔ پانی کی طرف ہاتھ پھیلا کر کھڑے رہنے سے قیامت تک پیاس دور نہیں ہوسکتی۔ اسی لیے کہا ہے کہ وَ مَا دُعَآءُ الْکٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ (13:14) جو لوگ خدا کے اس قانون کی صداقت سے انکار کرتے ہیں ان کی دعائیں رائیگاں چلی جاتی ہیں۔ جو دونوں ہاتھ اٹھا کر اللہ کو پکارتا رہے' دریا کے کنارے پانی بہہ رہا ہے' کنارے پہ کھڑا ہے' دعا بھی مانگ رہا ہے' لیکن آگے بڑھ کر پانی نہیں پیتا۔ تو یہ کیا ہے؟ یہی کہ یہ خدا کے قانون سے انکار کر رہا ہے۔ خود پانی نہیں پی رہا۔ اس واسطے اس کی' پانی پینے کی یہ دعا' اس کی یہ طلب اور مانگ' قیامت تک پوری نہیں ہوسکتی۔

معاشرے کے مظلوم اور مصیبت زدہ لوگوں کے مصائب و آلام کے حل کے لیے نظام کی اہمیت اور اس کی افادیت

عزیزانِ گرامیِ قدر! اس مقام پر یہ کہا جائے گا کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ اپنی جگہ بجا اور درست لیکن سوال یہ ہے کہ کیا خدا کی خدائی میں مظلوموں اور مصیبت کے ماروں کی کوئی داد فریاد نہیں' ان کے دکھوں کا کوئی مداوا نہیں' ان کی پریشانیوں کا کوئی علاج نہیں' ان کی دعاؤں کا سننے والا کوئی بھی نہیں؟ قرآن ان سوالوں کے جواب میں کہتا ہے کہ ان کی دعائیں سنی بھی جاتی

ہیں' قبول بھی کی جاتی ہیں' ان کی مدد بھی کی جاتی ہے' ان کے دکھ درد کو دور بھی کیا جاتا ہے لیکن اس کا طریقہ کچھ اور ہے۔ وہ طریقہ یہ ہے۔ اسے غور سے سنیے' عزیزانِ من! برس ہا برس کی محنت شاقہ اور تگ وتاز وپیہم کے بعد مدینے میں جماعت مومنین کی اپنی مملکت قائم ہوگئی لیکن جو مسلمان ہنوز مکے میں محصور تھے' قریش کی طرف سے ان پر مظالم کا سلسلہ شدید سے شدید تر ہوتا چلا گیا۔ اس انتہائی بے کسی اور مظلومیت کے عالم میں انہوں نے خدا سے دعا کی کہ بارِالٰہا! ہماری مدد کر' اور ہمارے لیے ان ظالمین کے جور وستم سے نجات حاصل کرنے کی کوئی صورت پیدا کر دے۔ انہوں نے خدا سے دعا کی اور آپ کو معلوم ہے کہ خدا نے کیا کیا؟ خدا نے وہاں کی جماعت مومنین سے کہا کہ وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (4:75) اے جماعت مومنین! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خدا کی راہ میں جنگ کے لیے نہیں اٹھتے۔ وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا (4:75) کیا تم سنتے نہیں ہو کہ مکہ کے مظلوم ومقہور' بے کس و بے بس' کمزور و ناتواں مرد عورتیں بچے کس طرح گڑگڑا کر ہم سے یہ فریاد کر رہے ہیں کہ بارِالٰہا! ہمیں اس بستی سے نکال لے جس کے رہنے والوں نے اس قدر ظلم واستبداد پر کمر باندھ رکھی ہے۔ اے مملکت اسلامی کے علمبردارو! کیا تم ان کی ان دعاؤں کو سن نہیں رہے اور اگر سن رہے ہو تو پھر انتظار کس بات کا ہے' ان کی امداد کے لیے اٹھتے کیوں نہیں' تم نہیں سن رہے کہ وہ ہم سے کس نالہ وزاری سے کہہ رہے ہیں کہ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَل لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا [1] (4:75)۔ وہ ہم سے فریاد کرتے ہیں۔

خدا کے لیے کیا مشکل تھا کہ وہ براہِ راست ان کی امداد کر دیتا اور انہیں دشمنوں سے نجات دلا دیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے اس مملکت سے' اس حکومت سے' اس نظام سے کہا جو اس کے نام پر اس کے قوانین کو نافذ کرنے کے لیے قائم ہوا تھا کہ کیا تم ان کی پکار کو سن نہیں رہے؟ اٹھو اور ان کی پکار کا جواب دو' ان کی مدد کے لیے آگے بڑھو۔ یہ ہے مظلوموں کی دعاؤں کے قبول ہونے کا صحیح طریقہ۔ یہی جماعت مومنین جو' اب مدینے میں تھی' تیرہ برس تک قریش کے بے پناہ مظالم کا تختہ مشق بنی رہی۔ انہوں نے اس زمانے میں خدا سے کچھ کم دعائیں تو نہیں کی ہوں گی لیکن چونکہ اس وقت دنیا میں کوئی نظام ایسا نہیں تھا جو مظلوموں کی دادرسی کے لیے وجود میں آیا ہو' اس لیے ان کی مدد کا کوئی سامان نہ ہو سکا۔ ان سے کہا جاتا رہا کہ ہمت واستقلال سے کام لے کر اپنے پروگرام پر جمے رہو۔ ایک دن تمہاری حکومت قائم ہو جائے گی تو ان تمام مشکلات کا حل

---

[1] اور ہمارے لیے' اپنی جناب سے کوئی محافظِ نگران' کوئی سرپرست اور مددگار بھیج دے۔ (مفہوم القرآن از پرویزؒ)

خود بخود مل جائے گا۔اس طرح تمہاری اپنی مشکلات ہی حل نہیں ہو جائیں گی بلکہ تم ان مظلوموں کی امداد کے قابل بھی ہو جاؤ گے جو ہم سے نصرت و اعانت کی دعائیں مانگیں گے۔

دیکھیے اس حقیقت کو قرآنِ کریم نے دوسری جگہ کس بلیغ انداز سے بیان کیا ہے۔فرمایا کہ اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاہُ وَ یَکْشِفُ السُّوْٓءَ (27:62) کہو کہ وہ کون ہے جو قلبِ مضطر کی دعائیں سنتا ہے اور ان کی مصیبتوں اور پریشانیوں کو دُور کر دیتا ہے؟ کس طرح دُور کر دیتا ہے' اس کے لیے کہا کہ وَ یَجْعَلُکُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ (27:62) وہ تمہیں حکومت و مملک عطا کر دیتا ہے۔ یہ ہے طریق خداوندی جس سے مظلوموں کی مصیبتیں رفع ہوتی ہیں۔آپ کو یہ معلوم ہی ہے کہ اس قسم کی حکومت بھی محض دعائیں مانگنے سے نہیں ملا کرتی۔خدا نے یہ کہا تھا کہ یہ ایمان و اعمالِ صالحہ کا نتیجہ ہوتی ہیں۔دوسرے مقام پر اسی جماعت مومنین کے متعلق کہا ہے کہ وَ الَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّھِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ ص وَ اَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ ص وَ مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ (42:38) یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کے بلاوے پر لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں' اس کے احکام و قوانین کی پوری پوری اطاعت کرتے ہیں' انہی کی روشنی میں اپنے امورِ مملکت باہمی مشورے سے طے کرتے ہیں اور جو سامانِ زیست خدا نے انہیں دے رکھا ہو' اسے رفاہِ عامہ کے لیے کھلا رکھتے ہیں۔ آپ نے غور فرمایا کہ یہاں بھی وَ اَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ (42:38) سے اشارا اسی نظامِ مملکت کی طرف ہے جسے دنیا سے ظلم اور ناانصافی دور کرنے کے لیے متشکل کیا جاتا ہے۔یہی وہ طریق تھا جس سے بنی اسرائیل کو قومِ فرعون کے مظالم سے نجات دلائی گئی۔

انسانی زندگی کی نفسیات پر معاشرتی خرابیوں اور نظام کی تباہ کاریوں کے اثرات کا نتیجہ

آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ مظلوموں اور بے کسوں کو خدا سے دعا مانگنے کی ضرورت کہاں اور کب پیش آتی ہے؟ اس کی ضرورت اس غلط معاشرہ میں پیش آتی ہے' جہاں کوئی بات قاعدے اور قانون کے مطابق نہ ہوتی ہو' جہاں ہر جگہ دھاندلی ہو رہی ہو' جہاں حقدار کو اس کا حق نہ مل سکتا ہو' جہاں مظلوم کی مدد کرنے اور ظالم کا ہاتھ روکنے والا کوئی نہ ہو' جہاں اس شخص کا کوئی پرسانِ حال نہ ہو جو معاشرہ میں تنہا رہ جائے' جہاں غنڈہ گردی ایسی ہو کہ شریف انسانوں پر عرصہ حیات تنگ ہو جائے' جہاں افراتفری اور نفسانفسی کا یہ عالم ہو کہ جو کہیں اتفاق سے گر جائے سب اسے روندتے ہوئے آگے بڑھ جائیں' کوئی اس کے اٹھانے کی فکر نہ کرے' جہاں کسی کو اس کا خیال نہ ہو کہ کس کے بچے بھوکے ہیں اور کس کے تن پر کپڑا

نہیں، جہاں مختلف مریض اس لیے بن آئی موت مر جائیں کہ ان کے پاس علاج کے لیے پیسہ نہیں تھا اور بیوہ ماں اپنے جوان بیٹے کی موت پر اس فکر میں گھلی جا رہی ہو کہ اس کا گور و کفن کیسے مل سکے گا اور اب میرا کیا بنے گا۔ یہ ہے وہ معاشرہ، جہاں بے کسوں اور ناداروں کو قدم قدم پر خدا سے دعائیں کرنا پڑتی ہیں کہ اس کے سوا ان کے سامنے امید کا کوئی اور سہارا نہیں ہوتا۔ یہی ہے وہ معاشرہ جس سے متاثر ہو کر کسی کہنے والے نے کہا تھا کہ

جو نہیں آشنا مصیبت کا درد و غم کا نہ جو شکار ہوا
جس پہ کوئی کبھی نہ وقت پڑا جو نہ اٹھ اٹھ کے رات کو رویا
وہ نہیں جانتا دعا کیا ہے
اسے معلوم کیا خدا کیا ہے

لیکن جب معاشرہ صحیح خطوط یعنی مستقل اقدارِ خداوندی پر متشکل ہو تو اس میں ہر بات کا فیصلہ قاعدے اور قانون کے مطابق ہوتا ہے، ہر حقدار کو اس کا حق ملتا ہے اور بغیر کسی پریشانی اور تردد کے ملتا ہے، نہ کسی پر کوئی ظلم ہوتا ہے نہ دھاندلی۔ اس میں ہر فرد کی ضروریاتِ زندگی مملکت کی طرف سے پوری ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اس لیے اس میں نہ کوئی محتاج ہوتا ہے، نہ بے نوا۔ اس میں نہ کوئی اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے، نہ بے سہارا۔ ایسے معاشرے میں کسی کو خدا سے وہ کچھ مانگنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی جس کے لیے ہم قدم قدم پر اپنے آپ کو محتاج اور لاچار پاتے ہیں اور خدا سے التجائیں کرتے ہیں۔

اس کسمپرسی اس محتاجی اور اس بیچارگی کے علاج کے لیے حضرت عمر فاروق کا فرمان

عزیزانِ من! اس حقیقت کبریٰ کو حضرتِ عمر فاروقؓ (581-644/45AD) نے ایسے بلیغ اور عمیق انداز میں بیان کیا ہے کہ جوں جوں انسان اس پہ غور کرتا ہے، روح وجد میں آ جاتی ہے۔ **آپ نے فرمایا تھا کہ لوگوں سن رکھو مجھے خلیفہ کیوں بنایا گیا؟ مجھے خلافت کا فریضہ اس لیے سونپا گیا ہے کہ میں تمہاری دعاؤں کو خدا تک پہنچنے سے روک دوں۔** اللہ اکبر! کتنی بلند حقیقتیں اس ایک جملے میں چھپی ہیں! کتنی بلند حقیقت ہے جسے اس قدر سادہ الفاظ میں بیان کیا گیا ہے! مطلب یہ کہ قیامِ خلافت کا مقصد یہ ہے کہ کسی ضرورت مند کی کوئی ضرورت رُکی نہ رہے۔ جب یہ ہو گی تو پھر کسی شخص کو اپنی ضروریات کے لیے خدا سے دعا کرنے کی حاجت ہی نہیں رہے گی اور اگر کوئی شخص اپنی کسی ضرورت کے لیے خدا سے دعا کرتا پایا گیا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ میں اپنے فریضے کی سرانجام دہی میں قاصر رہا ہوں اور وہ میرے خلاف گویا خدا سے شکایت کر رہا ہے۔ اس لیے مجھے فوراً احتساب خویش کرنا ہو گا اور اس امر کی کوشش کرنا ہو گی کہ میری شکایت بارگاہِ خداوندی تک نہ

پہنچنے پائے۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ ضرورت مند کی ضرورت اس کے مانگنے سے پہلے ہی پوری ہو جائے۔ لہٰذا تم اپنی ضروریات اور اپنی احتیاجات کے لیے خدا سے براہِ راست دعا کرنے کی بجائے اسے مجھ تک پہنچایا کرو۔ یہاں وہ پوری ہو جائیں گی' تمہاری دعا کے خدا تک پہنچنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی' البتہ جب یہاں ضرورت پوری نہ ہو اور اگر ایسا وقت آ جائے تو میں اس سے پیشتر اس خلافت کے منصب سے الگ ہو جاؤں گا۔ یہ ہوتی ہے' عزیزانِ من! اس معاشرہ کی کیفیت جو وحی کی رہنمائی میں متشکل ہوتا ہے۔ اس میں کسی کو اپنی انفرادی ضروریات کے لیے خدا سے کچھ مانگنا نہیں پڑتا۔ جسے سب کچھ از خود مل رہا ہو' اسے مانگنے کی ضرورت کیا ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم میں مومنین کی جس قدر دعائیں مذکور ہیں وہ اجتماعی ہیں' انفرادی نہیں ہیں اور یہ اجتماعی دعائیں مانگی ہی اس مقصد کے لیے جاتی ہیں کہ ان کے ہاتھوں سے وہ نظام قائم ہو جائے جس میں کوئی مصیبت زدہ مظلوم نہ ہو' جس میں عالم گیر انسانیت کے مصائب اور آلام کا علاج ہوتا چلا جائے گا۔ یہ ہیں وہ دعائیں جو جماعت مومنین خدا سے مانگتی ہے۔ اجتماعی دعائیں ایک فرد کے لیے نہیں اور یہ جو آیت ہمارے زیرِنظر ہے' اس میں بھی کہا گیا ہے کہ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (1:4) ہم تجھ سے استعانت چاہتے ہیں۔

آخر کار سوال یہ کہ بیماری میں دعائیں کرتی کیا ہیں یا ان کا نتیجہ کیا نکلتا ہے

یہ سب کچھ کہنے کے بعد بھی ایک اہم سوال سامنے آتا ہے کہ دعائیں انفرادی ہوں' اجتماعی ہوں سوال یہ ہے کہ ان سے بالآخر ہوتا کیا ہے' ان کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور غور سے سمجھنے کے قابل۔ اس لیے کہ یہی وہ محور ہے جس کے گرد دعا کا سارا مسئلہ گردش کرتا ہے۔ دعا سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کے ساتھ ہی جو کچھ قرآنِ کریم نے کہا ہے' اس کے معنی یہ ہیں کہ دعا کے بعد اس پروگرام پر عمل پیرا ہونا بھی ضروری ہے جس سے یہ مقصد حاصل ہوتا ہے۔ پھر اس میں جو ''دعا'' درمیان میں آتی ہے اس کا مقصد کیا ہے' کیا وہ بیکار ہے؟

یہ بڑی اہم چیز ہے اور اسے غور سے سنیے کہ اس کی اہمیت کیا ہے؟ دنیا میں کوئی کام کرنا ہو' تو اس کے لیے سب سے پہلے ہمارے دل میں آرزو ابھرتی ہے۔ اسے پھر دہرا دوں کہ دنیا میں کوئی کام کرنا ہو' اس کے لیے سب سے پہلے ہمارے دل میں آرزو پیدا ہوتی ہے' ایک تقاضا بیدار ہوتا ہے۔ دنیا میں عمل کی بنیاد آرزو ہے۔ اقبالؒ (1877-1938) کے الفاظ میں

مازِ تخلیقِ مقاصد زندہ ایم

دنیا میں ہر عمل کی بنیاد آرزو کی رہین منت ہوتی ہے

ہماری زندگی کا ثبوت یہ ہے کہ ہم مقاصد کی تخلیق کرتے چلے جائیں اور اس کے بعد

از شعائے آرزو تابندہ ایم

ہماری زندگی میں نورانیت اور چمک اس سے پیدا ہوتی ہے کہ اس کے لیے آرزو بیدار ہو۔ یہ شعائے آرزو ہے کہ جس سے ہماری زندگی روشن ہوتی ہے۔ جس قدر یہ آرزو شدید ہوگی اسی قدر ہمارا ارادہ مستحکم ہوگا اور جس قدر ارادہ مستحکم ہوگا' اسی نسبت سے ہم اس مقصد کے حصول کے لیے جدوجہد کریں گے۔

علامہ اقبالؒ (1877-1938) نے بچوں کے لیے ایک نظم [1] لکھی ہے جسے ہم ابتدائی مدارس (Schools) کے ہر طالب علم کی زبان سے ہر روز سنتے ہیں۔ اس کا پہلا شعر یہ ہے:

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

دعا کے سلسلہ میں علامہ اقبال کی یہ نظم نفسیاتی تبدیلی کو بدلنے کی ایک بنیاد ہے

اس شعر کے پہلے مصرعے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ یوں تو بچوں کے لیے ہے لیکن اس میں جو حقیقت بیان ہوئی ہے' وہ بڑی عمیق ہے یعنی جب انسان کی دلی تمنا حروف اور الفاظ کی شکل میں زبان پر آتی ہے' تو اسے دعا کہا جاتا ہے: جتنی گہری تمنا' اتنی ہی مخلص دعا' جتنی شدید آرزو اتنی ہی پرکیف پکار' دعا۔ نفسیات کا طالب علم اس حقیقت سے واقف ہے کہ آرزوؤں کی بیداری سے انسان کے اندر کس کس قسم کی نفسیاتی تبدیلی واقع ہوتی ہے پھر جس قسم کی وہ آرزو اسی قسم کی نفسیاتی تبدیلی۔ اس نفسیاتی تبدیلی سے انسان کا زاویہ نگاہ بدل جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ زاویہ نگاہ کی تبدیلی سے خارجی دنیا میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔

اقبالؒ ہی کے الفاظ میں ہے کہ

قیمت ہر شے زِ اندازِ نگہہ

ہر شے کی قیمت نگاہ کے انداز سے' ہے۔ نگاہ کا زاویہ بدل لو' اس کی دنیا بدل جائے گی۔

---

[1] اقبالؒ: بچے کی دعا (ماخوذ) بانگِ درا' نیشنل بک فاؤنڈیشن' اسلام آباد' 1996' ص ص۔ 48-47

ہر شے کی قیمت آرزو کے بدلنے میں ہی مضمر ہے

ساری دنیا ''من'' کی دنیا ہے:

میں اب سمجھا کہ دنیا کچھ نہیں، دنیا مرا دل ہے
بدل جانے سے اس کے رنگ ہر اک چیز کا بدلا

دوسرے ایک شعر میں ہے کہ

نہ کلی ہے وجہِ نظر کشی، نہ کنول کے پھول میں تازگی
فقط ایک دل کی شگفتگی، سبب نشاطِ بہار ہے [1]

بہرحال یہ حقیقت ہے کہ انسان کی شدت آرزو سے اس کے اندر ایسی نفسیاتی تبدیلی (Psychological Change) پیدا ہو جاتی ہے جو اس کا اندازِ نگاہ بدل دیتی ہے اور اس کی آرزو میں جس قدر ارتکاز پیدا ہوتا ہے اسی قدر اس میں توانائیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ یہ جو اقبالؒ [2] (1877-1938) نے کہا تھا کہ ''عشق کی ایک جست نے طے کر دیا قصہ تمام'' وہ شدت آرزو کی ہی پیدا کردہ توانائی کی رو سے ہوتا ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک آرزو کا معیار

آرزو کے سلسلے میں دو باتیں بنیادی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ آرزو کس قسم کی ہے؟ انسان کے دل میں مختلف آرزوئیں پیدا ہوتی رہتی ہیں لیکن قرآن مومن کے سامنے صحیح آرزو کا جو معیار رکھتا ہے، وہ یہ ہے کہ وَ مَا تَشَآئُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ

---

[1] پرویزؒ (1903-1985) نے اپنی کتاب ''انسان کے کیا سوچا؟'' کے پہلے ایڈیشن میں خارج میں نہ بہار ہے نہ خزاں، نہ نغمہ ہے نہ فغاں، لکھنے کے بعد یہ شعر اسی طرح سے درج کیا ہے۔ سچ کہا تھا پروفیسر وائٹ ہیڈ نے اپنی کتاب Science and the modern world میں کہ 'نہ پھول اپنی مشام جاں نواز کے لیے درخورِ تحسین ہے، نہ عندلیب اپنے نغمہ دل ربا کے لیے۔ اور نہ آفتاب جہانتاب اپنی نور افگنی کے لیے کسی تعریف و توصیف کا مستحق ہے .....اپنے قصائد کا ممدوح خود اپنے ''دل'' (Mind) کو قرار دینا چاہیے۔ فطرت تو یکسر بے آب و رنگ واقع ہوئی ہے۔ نہ اس میں چنگ و رباب ہے، نہ رنگ و شباب۔ یہ سب کچھ ہمارے اپنے اندر ہے۔'' ''حواس (Senses) ذریعہ عمل'' میں ''دل (Mind) کی دنیا'' کے لیے انسان نے کیا سوچا؟ کے پہلے ایڈیشن کے صفحات 102 تا 104 پڑھیے۔

[2] بالِ جبریل: عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام — اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

(81:29) تمہیں اس کا اختیار ہے کہ جو جی میں آئے' اسے چاہو' لیکن مومن کے لیے ضروری ہے کہ وہ وہی چاہے' جو خدا چاہتا ہے اور اس طرح اپنی آرزوؤں کو مشیت خداوندی سے ہم آہنگ رکھے۔ جس بات کو خدا نے برا قرار دیا ہے' تم بھی اسے برا سمجھو۔ جسے اس نے اچھا کہا ہے تم بھی اسے اچھا سمجھو۔ تم ویسا بننے کی کوشش کرو جیسا خدا چاہتا ہے کہ تم بن جاؤ۔

قرآنِ کریم کے متعلق اقبالؒ (1877-1938) نے کہا ہے کہ

آنچہ حق می خواہد آں ساز دترا

یہ تمہیں وہ کچھ بنا دے گا جو خدا چاہتا ہے کہ تم بن جاؤ۔ لہٰذا سب سے پہلے پہلا ضروری مرحلہ یہ ہے کہ ہم دیکھیں کہ جو آرزو ہمارے دل میں پیدا ہو رہی ہے' وہ خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق ہے یا نہیں۔ اگر یہ ویسی نہ ہو تو اسے تبدیل کر کے مستقل اقدار سے ہم آہنگ کر لینا چاہیے۔ تو اس کے اندر پہلی چیز تو یہ آئی۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ دل میں صرف آرزو کی بیداری سے مقصد حاصل نہیں ہو جاتا۔ آپ کسی جگہ جانے کا ارادہ رکھتے ہیں' آپ کے دل میں وہاں جانے کی آرزو بیدار ہوتی ہے۔ اب اس کے بعد اگر آپ اسی طرح گھر میں بیٹھے رہیں' تو آپ اس منزلِ مقصود پر نہیں پہنچ پائیں گے۔ اس کے لیے اگر آپ کو ریل میں جانا ہے تو ریلوے ٹائم ٹیبل کنسلٹ کرتے ہیں' گاڑیوں کے اوقات دیکھتے ہیں' انکوائری والوں سے دریافت کرتے ہیں' پھر مقررہ وقت' اور مقررہ تاریخ پر گھر سے چلتے ہیں' اسٹیشن پر پہنچتے ہیں' ٹکٹ خریدتے ہیں' گاڑی کا انتظار کرتے ہیں' صحیح گاڑی میں بیٹھتے ہیں' جو گاڑی سامنے آ جائے اسی میں نہیں بیٹھ جاتے' جو گاڑی آپ کو منزلِ مقصود تک پہنچانے والی ہے اس میں بیٹھتے ہیں اور یہ وہ گاڑی ہے جو آپ کو منزلِ مقصود تک پہنچاتی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ دل میں کسی جگہ پہنچنے سے یا آرزو کے بیدار ہونے سے' اور وہاں تک پہنچنے کے درمیان یہ جتنے مراحل آتے ہیں' وہ سارے اس پروگرام کا حصہ ہوتے ہیں کہ جس سے اس آرزو کی تکمیل ہوتی ہے۔ یہی آرزو' ایسی آرزو ہے جو اس مقصد تک پہنچانے کے لیے دل میں اٹھے۔ یہ خدا نے مستقل اقدار کی رو سے آپ کے لیے' انسان کی اپنی ذات کی نشوونما اور عالمگیر انسانیت کی نشوونما کے لیے' مقرر کیا ہے۔ یہ آرزو بیدار ہو اور پھر اس کے لیے وہ تمام اسباب اور سامان اکٹھا کیا جائے جو اس کے لیے متعین کیا گیا ہے اور اس کی ہدایت کے مطابق اس گاڑی میں سوار ہوا جائے جو آپ کو اس منزلِ مقصود تک پہنچا دے گی۔

داخلی تبدیلی کے بغیر خارجی تبدیلی ممکن ہی نہیں

بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا کہ ''دعا'' سے انسان کے اپنے اندر ایک نفسیاتی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ اپنے اندر نفسیاتی

تبدیلی کا پیدا ہونا بڑی اہم چیز ہے۔ کس قدر قابل رشک ہے وہ انداز، جس میں اقبال (1877-1938) نے اتنی بڑی، بلند، عمیق، دقیق حقیقت کو دو مصرعوں میں واشگاف کر دیا ہے! میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بلیغ اور دل کش انداز تصور میں نہیں آ سکتا۔ آپ بھی سنیے اور میری طرح وجد میں آ جایئے۔ وہ کہتا ہے کہ

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی

یہاں ''قضا'' سے مراد ''قانونِ خداوندی'' ہے:

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی
مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے

کیا بات ہے! کیا کہہ گیا!! اسی کے ساتھ دوسرا شعر ہے کہ

تری دعا ہے کہ ہو آرزو تری پوری
مری دعا کہ تری آرزو بدل جائے

کہا کہ تیری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی، مگر اس سے یہ ممکن ہے، کہ تو بدل جائے اور یہ جو تبدیلی ہے کہ تو بدل جائے، وہ قرآنِ کریم کے اندر ڈوبنے سے یعنی اپنی آرزوؤں کو اس کے قوانین سے ہم آہنگ کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ قرآن کے متعلق اقبال نے کیا کیا کچھ کہا ہے!! کہ

چوں بجاں در رخت جاں دیگر شود

یہ جب دل کی گہرائیوں کے اندر اتر جاتا ہے تو جہاں دیگر شود۔ [1] اور انسان کے اندر جب وہ تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے تو خارج میں خود بخود تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ خارجی انقلاب آ ہی نہیں سکتا جب تک انسان کے اندر داخلی انقلاب پیدا نہ ہو اور یہ وہ حقیقت ہے جسے قرآنِ کریم نے بڑے ہی بلیغ الفاظ میں کہا کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ (13:11) یاد رکھو! تم تو ایک طرف، ساری دنیا بھی زور لگا کر دیکھ لے کسی قوم کی حالت میں کبھی تبدیلی نہیں آ سکتی تاوقتیکہ اس قوم کے پہلے اندر نفسیاتی تبدیلی نہ پیدا ہو۔ اس کی خارج کی تبدیلی کا دارومدار اس کی داخلی تبدیلی کے اوپر ہے، اس کی نفسیاتی تبدیلی کے اوپر ہے اور یہ ہے جو ''دعا'' سے حاصل ہوتی ہے۔ اس چیز سے انسان کے اندر ایک داخلی تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ عزیزانِ من! یہ ہے، دعا کی اہمیت اور غایت۔

---

[1] دنیا بدل جاتی ہے۔

میں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ انسان کی ہر کوشش یا عمل کا آغاز اس کے دل میں پیدا ہونے والی خواہش یا آرزو سے ہوتا ہے۔ یہی آرزو شدید ہو کر ارادہ بنتی ہے اور ارادہ کے مستحکم ہونے کے بعد اس مقصد کے حصول کے لیے قدم اٹھتا ہے۔ قدم اٹھانے کا مرحلہ بڑا اہم ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی بڑا نازک بھی۔ آپ گھر سے کسی جگہ جانے کا ارادہ لے کر نکلتے ہیں' اس جگہ پر پہنچنے کے لیے سب سے پہلی اور لاینفک شرط یہ ہے کہ آپ صحیح راستہ پر گامزن ہوں۔ اگر آپ کا قدم غلط راستہ پر پڑ گیا تو آپ مسافت بھی طے کریں گے جس میں آپ کا وقت اور توانائی بھی صرف ہو گی لیکن آخر الامر ہو گا یہ کہ نہ صرف آپ منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکیں گے بلکہ آپ اس سے بہت دور ہٹ چکے ہوں گے۔ لہٰذا جب آپ نے وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (1:4) کہہ کر خدا سے منزلِ مقصود تک پہنچنے کی آرزو کا اظہار کیا اور اس کے لیے اس کے اعانت طلب کی تو اس کا مطلب یہ تھا کہ آپ نے سب سے پہلے یہ چاہا کہ اس منزل تک پہنچنے کا صحیح یا سیدھا راستہ آپ کے سامنے آ جائے۔ اس کے لیے آپ کے دل کی آرزو یہ دعا بن کر آپ کے لبوں تک آئی کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ (1:5) ہمیں اس سیدھے راستے کی راہنمائی مل جائے جو ہمیں منزلِ مقصود تک پہنچا دے۔ یہ سورۃ الفاتحہ کی اگلی یعنی پانچویں آیت ہے اور اسے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀.....❀❀.....❀

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

غیر ممکن ہے کہ حالات کی گتھی سلجھے
اہلِ دانش نے بہت سوچ کے الجھائی ہے

مجھے اعتراف ہے کہ تاریخ کے اس موڑ پہ میرے پاس اگر کچھ کہنے کو ہے تو وہ کچھ ایسا نہیں کہ اکثریت کو قابل قبول ہو۔

ٹی وی پہ اکثر مذہبی پروگرام بھی دیکھنے کو ملتے ہیں فرصت ہو تو دیکھتا بھی ہوں، بڑے بڑے علماء، علم و دانش کے خزانے لٹاتے ہیں مگر بات آخر کو وہیں کی وہیں رہتی ہے جہاں سے شروع ہوتی ہے اور وہیں ختم ہوتی ہے جہاں امت صدیوں سے رکی ہوئی ہے۔۔۔ وہی بحثیں ہیں۔۔۔ فروعات کو تو جانے دیجئے لمبی لمبی بحثیں، آمدِ قیامت۔۔۔ دجال، نزولِ مسیح، وغیرہ وغیرہ پہ ہوتی ہیں۔۔۔ اور اینڈ آف ٹائم (End of time) قسم کی کتابیں بھی مارکیٹ میں آ گئی ہیں۔۔۔ جن کے متعلق یہ دعوے ہوتے ہیں کہ مسائل پہ قرآن وسنت کی روشنی میں وضاحت کی گئی ہے۔

اس وقت میرے پیش نظر یہ معاملہ بھی نہیں کہ ان دعاوی میں کس حد تک حقیقت بیانی ہے اور کس قدر افسانہ تراشی۔ سوال تو یہ ہے کیا اس مسئلے پہ کسی حتمی نتیجہ پر پہنچ کر ہم امت کا کوئی مسئلہ حل کر لیں گے عالمی سیاست میں قابل ذکر کردار ادا کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔

فقہ کے بڑے بڑے ماہرین آتے ہیں، مشکل محاوراتی اور ٹیکنیکل زبان میں بات کو یوں الجھاتے ہیں کہ ذہن مزید تشکیک کا شکار ہو جاتے ہیں۔

حکومت بھی ماشاءاللہ وقفے وقفے کے بعد علمائے کرام سے اپیلیں کرتی رہتی ہے کہ اختلافات کو ختم کر کے فرقوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے میں اپنا کردار ادا کریں اور حکومت کی مدد کریں، کوئی تو پوچھنے والا پوچھے اللہ کے نیک بندو یہ تو دیکھو کہ یہ اختلافات پیدا کس نے کئے، کون ان کو ہوا دیتا رہتا ہے۔

یہ مباحث بات کو مزید الجھانے کا باعث بنتے رہتے ہیں اور اب تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ:

غیر ممکن ہے کہ حالات کی گتھی سلجھے
اہلِ دانش نے بہت سوچ کے الجھائی ہے

اس صورت حال میں مجھ سا کم علم کیسے دخل اندازی کرے مگر کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ کوئی نعرہ مستانہ بلند کیا جائے۔۔۔

فقیہہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا
قلندر جز دو حرفِ لا الہ کچھ بھی نہیں رکھتا

جی تو چاہتا ہے کہ فقیہوں کی موشگافیوں کے علی الرغم دل کی بات کہہ دی جائے لیکن زمینی حقائق پہ نظر ہو تو معلوم ہو جائے گا کہ ایسی آواز بس صدا بصحرا ہوگی' ہاں کہنے والا ممبر و محراب پہ معتوب ہوگا کم سے کم گمراہ (ورنہ کچھ زیادہ بھی) کہا جا سکتا ہے۔ روشن خیال اعتدال پسند حکومت بھی ان لوگوں کا سامنا نہیں کر سکتی' ایک قدم آگے اور دو قدم پیچھے والا معاملہ چلا آ رہا ہے۔۔ بیچارے معذور ہیں کہ ان کے ساتھ چلنے والوں کے پاس کوئی ایسا صاحب علم بھی نہیں جو قال اللہ اور قال الرسولؐ کہہ کر ان کو جواب میں کچھ کہہ سکے' سمجھا سکے میری تو بساط ہی کیا' اس لئے عافیت اسی میں ہے کہ

فیصلہ دیکھ فقیہانِ حرم کا ساقی
میرے ہونٹوں پہ رہے دشنۂ تعزیر ابھی

چلتے چلتے ایک بات اور کہتا جاؤں' شاید کوئی صاحب ہمت کر کے بات آگے بڑھا سکیں۔

امت پہ کڑے وقت پہلے بھی آتے رہے ہیں' پکارنے والے اس وقت بھی جسمانی طور پہ نہیں تو ذہنی طور پر اس ذات اقدس و اعظم کے در پر حاضر ہو کر فریاد کناں رہے:

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے
امت پہ تری آج عجب وقت پڑا ہے

لیکن ایسی قیامت تو پہلے کبھی نہ ٹوٹی تھی جیسی اب ہے' حیرت ہے ٹی وی پر قیامت پہ بحثیں کرنے والے اس قیامتِ موجود پہ کیوں اپنے خیالات کے موتی نہیں بکھیرتے۔

اقبال نے ایک بار ایسی سعادت حاصل کی اور تحفہ سمجھ کے کیا چیز نذر کی تھی۔۔ یاد کیجئے انہوں نے کہا تھا کہ آ بگینہ لایا ہوں اور اس میں تھا کیا'

طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

ہمیں یہ سعادت کہاں نصیب۔۔۔ سوچتا ہوں اگر اقبال آج ہوتے تو کیا ہوتا' آج تو خونِ مسلم کی وہ ارزانی ہے کہ اللہ کی یہ زمین' یہ دھرتی توڑا بوڑا سے لے کر گروزنی اور کشمیر سے لے کر بغداد' موصل اور تکریت تک خونِ مسلم سے گلرنگ ہے۔۔۔ کب تک ایسا ہوتا رہے گا' اس کا کوئی انت' کوئی آخر ہے۔۔۔؟

مسلمان جیسے کیسے بھی ہیں آخر کو اس کے نام لیوا ہیں:

خوار ہیں' بدکار ہیں ڈوبے ہوئے ذلت میں ہیں
کچھ بھی ہیں لیکن ترے محبوب کی امت میں ہیں

یہ نہیں کہ اس کا کوئی حل نہیں' یہ پیغام ختم نہیں کیا جا سکتا' کوئی اسے مٹا نہیں سکتا' اس کو تو۔۔۔ ہمارا ایمان ہے کہ آخر الامر

غالب آ کر رہنا ہے'

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

بات (Clear Thinking) واضح سوچ اور جرأت کی ہے' منزل کے تعین کی اور اس کی طرف بڑھنے کے لئے حکمت عملی (Strategy) کی۔۔۔راستہ لمبا اور کٹھن ضرور ہے' ضرورت استقامت کی ہے یقین کی ہے اور صبر کی ہے۔

جب منزل کا تعین ہو جائے' **تواصو** پیدا ہو جائے' یکسو ہو کر سب اس سمت گامزن ہو جائیں تو صدیوں کے فاصلے سالوں میں اور سالوں کے دنوں میں طے ہو جاتے ہیں۔۔۔شرط ہے سر جوڑ کر قرآن پاک کی۔۔۔ صرف قرآنِ پاک کی روشنی کو مشعلِ راہ بنانے کی' سو میرے عزیزو۔۔۔**ثم تتفکروا!**

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی

خالص قرآنی نظریات کی واحد تحریک

موقر رسالہ طلوع اسلام، قیام پاکستان سے پیشتر شائع ہونا شروع ہو گیا تھا۔ قیام پاکستان کے لئے اس رسالہ نے بھرپور کوششیں کیں۔ چونکہ ہمارا مذہبی طبقہ قیام پاکستان کے خلاف تھا، اس لئے مسلم لیگ کی طرف سے یہ رسالہ ہی علماء کے اعتراضات کا جواب دیتا تھا اور انہیں پاکستان کے قیام کی ضرورت پر قرآن و حدیث سے دلائل پیش کرتا تھا۔ چونکہ ہمارے علماء کرام دو قومی نظریہ کے مخالف تھے، اس لئے اس رسالہ نے اس موضوع پر بڑے پُرمغز مضامین شائع کئے۔ اس وقت اس مختلف فیہ نظریہ کا نام ''معرکۂ دین و وطن'' قرار پایا تھا۔ اگرچہ یہ مضامین قبل قیام پاکستان تحریر کئے گئے تھے، لیکن چونکہ یہ مسئلہ ایک استمراری حیثیت کا حامل ہے، اس لئے وہ ٹھوس مضامین آج بھی اسی اہمیت کے حامل ہیں جس قدر وہ اپنے تحریر کئے جانے کے وقت تھے چونکہ قیام پاکستان کے بعد، اب تک بھی ہمارے علماء کرام متحدہ قومیت کے ہی قائل ہیں۔ اس لئے ان مضامین کی افادی حیثیت اب بھی اسی طرح برقرار ہے۔ قیام پاکستان کے بعد جنوری ۱۹۴۸ء سے یہ رسالہ کراچی سے شائع ہونا شروع ہوا، اور اس نے ایک قرآنی تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ جس درجہ اِن خالص قرآنی نظریات کی اشاعت ہوئی، اسی درجہ ہماری پیشوائیت کی طرف سے اس کی مخالفت بڑھتی چلی گئی، اس وقت تک تقریباً دو سو کتابیں اس تحریک کے خلاف طبع ہو چکی ہیں۔ ان میں سے بیشتر سطحی معیار کی ہیں، اس تحریک کے خلاف جو غلط الزامات لگائے گئے ہیں، ان کتابوں نے ان پر ہی تبصرہ کیا ہے۔ ان کتابوں کا زیادہ تر زور حجیت حدیث پر رہا۔ کچھ کتابوں نے اس تحریک کے نظریہ ''مرکز ملت'' پر بھی محاکمہ کیا اور اس کی تردید کرنی چاہی۔ البتہ اس تحریک کی تردید میں چند کتابیں علمی انداز کی بھی بلند پایہ علماء نے تحریر کیں، جو ہمارے مذہبی، روایتی طبقہ میں بہت مقبول ہوئیں، لیکن حیرت یہ ہوتی ہے کہ آپ ان تمام کتب کا بالاستیعاب مطالعہ فرما لیں تو آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ہماری پیشوائیت اس تحریک کی اصل و اساس کی گرفت ہی نہیں کر سکی کیونکہ

اس اصل و اساس کے خلاف ان کی تمام کتب میں ایک لفظ بھی نہیں ملتا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس تحریک کی اصل و اساس ہمارے علمائے کرام کے اوپر سے ہی گذر گئی اور اس کی اصل حقیقت تک ان کی رسائی نہیں ہوئی۔

اس بارے میں ہمارے علماء کرام بھی بے قصور ہی ہیں کیونکہ آپ ایک ہزار سال کا پورا تفسیری و روایتی لٹریچر مطالعہ فرمالیں آپ کو یہ فقرہ یا اس فقرے کا مفہوم یا یہ نظریہ کسی جگہ نہیں ملے گا کہ قرآن کریم کے مطابق ''خدا کی محکومیت اور خدا کی عبادت ایک ہی چیز ہے''۔ اور یہی فقرہ یا اس فقرہ کا مفہوم اس تحریک کی بنیاد اور اصل الاصول ہے۔ اور یہی وہ العروۃ الوثقیٰ ہے جو اس تحریک کا محور ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ جو شخص بھی خدا کی عبادت کرنا چاہے' اس کے لئے خدا کی محکومیت اختیار کرنا لازمی و لابدی ہے وہ کسی اور کی محکومیت میں نہیں رہ سکتا۔ وہ جس درجہ خدا کی عبادت زیادہ کرنا چاہے' اس درجہ اسے حکومت خداوندی کی اطاعت کرنی ضروری ہوگی۔ طلوع اسلام کے مطابق تو متقی وہ ہے جو اسلامی حکومت کی اطاعت کرتا ہے' اسلامی حکومت کی اطاعت سے ہی تقویٰ میں اضافہ ہوتا ہے کیونکہ اسلامی حکومت کی اطاعت ہی تقویٰ ہے۔ اس نظریہ کی رو سے انفرادی اطاعت یا انفرادی پرستش کی جڑ بنیاد اکھڑ جاتی ہے اور انفرادی صلوٰۃ (نماز) کی کوئی جگہ نہیں رہتی۔ صلوٰۃ تمکن (۲۲/۴۱) یا صلوٰۃ موقت (۴/۱۰۳) دونوں اسلامی حکومت کے ماتحت قائم ہوتی ہیں۔ پہلے صلوٰۃ تمکن وجود پذیر ہوتی ہے تو اس میں صلوٰۃ موقت قائم ہوتی ہے۔

اس تحریک کا یہ منفرد نظریہ ہے کہ قرآن کریم کی رو سے مومن کا فرض ہے کہ وہ قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ آخری ضابطہ حیات تسلیم کرے اور اس دنیا میں نظام خداوندی کو برپا کرنے کی پوری پوری جدوجہد کرے' وہ جس ملک میں بھی ہو وہاں سے اس کوشش کو شروع کردے کیونکہ نظام خداوندی کو برپا کرنا کسی مقام اور کسی زمانہ سے مخصوص نہیں ہے۔ اس کی پوری پوری کوشش یہی ہونی چاہئے کہ تمام نظامہائے باطل کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر پھینک دے اور اللہ تعالیٰ' رب العزۃ' کی زمین پر صرف اور صرف اللہ کا قانون اور نظام جاری کردے اس لئے کہ اسی نظام کی اطاعت' اللہ و رسول کی اطاعت ہے' جو لوگ اللہ و رسول کی اطاعت کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے تو نہایت ہی ضروری ہے کہ وہ ان کا عطا کردہ نظام جاری کریں۔ جو لوگ اللہ کے نظام کے علاوہ کسی اور نظام کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر آمادہ ہوں وہ اللہ کے نافرمان' مجرم (۶/۱۲۳) ظالم و فاسق (۴/۴۴' ۴/۴۵) ہیں۔ خواہ وہ کتنے ہی نماز اور روزہ کے پابند ہوں۔ کیونکہ ان کے اعمال اللہ کے ہاں قبول نہیں ہوں گے اور وہ آخرت میں بھی خسارہ میں رہ جانے والے ہوں گے (القرآن ۳/۸۵) اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی خوب واضح رہے اور ہمیشہ

پیشِ نظر رکھنی ضروری ہے کہ غیر اسلامی حکومت میں جس قدر رزق بھی' معاشرہ کے مقرر کردہ جائز طریقوں سے کمایا جاتا ہے وہ بھی قرآن کریم کی رو سے حرام ہوتا ہے' اس رزق کا ایک ایک لقمہ حرام ہے کیونکہ قرآن کریم ان ذرائع کو ہی جائز قرار نہیں دیتا۔ ربٰو' ملکیت زمین' کرایہ' مضاربت' بغیر محنت کئے ہوئے سرمایہ پر سرمایہ حاصل کرنا' یہ وہ ذرائع ہیں جو طاغوتی نظام میں جائز ہوتے ہیں' لیکن قرآن کریم کے مطابق یہ تمام ذرائع بذاتِ خود حرام ہیں۔ اس لئے ان ذرائع سے حاصل کردہ آمدنی خود بخود حرام ہو جاتی ہے۔ خوب یاد رکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو رزق فراہم کر دیا ہے' لیکن اس کی انفرادی تقسیم انسانوں کے ہاتھوں میں نہیں رکھی' کیونکہ طاغوتی نظام میں اس تقسیم سے ناہمواریاں پیدا ہوتی ہیں اور یہ تقسیمِ رزق ظلم پر مبنی ہوتی ہے۔ جبکہ قرآنی نظام میں یہ ناہمواریاں پیدا نہیں ہوتیں اور وہ نظام ایک ایک فرد کے رزق کا ذمہ دار ہوتا ہے (۶/۱۱'۱۵۱/۶)۔

عبادت الٰہی کی عملی شکل محکومیت خداوندی قرار دینا..... یہ وہ نادر و منفرد نظریہ ہے کہ جو تحریک طلوع اسلام نے پیش کیا۔ یہ قرآنی نظریہ چونکہ ہمارے ہاں ایک ہزار سال سے نظر انداز کیا ہوا ہے' اس لئے ہماری پیشوائیت بھی اس کی قائل نہیں ہے اور وہ طلوع اسلام کی تحریک میں بھی اس نظریہ کو Detect نہیں کر سکی اور یہ ان کے سر کے اوپر سے گذر گیا۔ وہ In Between the line پڑھ ہی نہیں سکے۔ کیونکہ اول تو ہمارے علماء کرام اسلامی حکومت کے قائل ہی نہیں ہیں۔ اسی وجہ سے انہوں نے قیام پاکستان کی مخالفت بھی کی تھی' لیکن حالات کے تھپیڑوں سے مجبور ہو کر جو علماء کرام اسلامی حکومت کے قائل ہوئے بھی' اور جو چند تحریکیں اسلامی حکومت کو قائم کرنے کے لئے پاکستان یا بیرونِ پاکستان اٹھیں' ان سب کے نزدیک اسلامی حکومت کا قیام صرف ایک Luxury ہی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اسلامی حکومت کے قیام سے جرائم کم ہو جائیں گے' ملک میں امن و امان قائم ہو گا' فحاشی ختم ہو جائے گی' عورتیں پردہ کرنے لگ جائیں گی' مرد بڑی بڑی داڑھیاں رکھ لیں گے' پاجامے ٹخنوں سے اوپر تک ہو جائیں گے' گانا' سینما' T.V' Video پر پابندی لگ جائے گی۔ جبکہ اس کے برخلاف طلوع اسلام کے نزدیک اسلامی حکومت کا قیام ایک Luxury نہیں ہے بلکہ اس کا قیام اس تحریک کی مجبوری' ضرورت اور Requisite ہے۔ کیونکہ اس تحریک کے نزدیک اللہ کی عبادت کرنے کے لئے اس کا قیام ضروری و لازمی ہے۔ آج جبکہ دنیا میں کسی جگہ بھی اسلامی حکومت قائم نہیں ہے' اس تحریک کے نزدیک زمین کے ایک چپہ پر بھی عبادت خداوندی نہیں ہو رہی ہے۔ جبکہ ہمارے علماء کرام کے نزدیک عبادت الٰہی ہو رہی ہے۔ اس لئے ان کے نزدیک اسلامی حکومت کا قیام کوئی اہمیت نہیں رکھتا یہ محض ایک Luxury ہے۔ جو تحریکیں اسلامی نظام

اور اسلامی حکومت کی داعی بھی ہیں' ان سب کی بھی وہی پوزیشن ہے جو علماء کی ہے۔ وہ بھی علماء یا عامتہ المسلمین سے نظریاتی طور پر بہتر نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ بھی عبادت خداوندی کو اسلامی حکومت کی اطاعت قرار نہیں دیتے' ایران کی اسلامی حکومت بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ ان کے ہاں بھی عبادت کا انفرادی تصور باقی ہے۔ یہ بات خوب ذہن نشین کر لیجئے کہ جب تک اور جہاں کہیں بھی عبادت کا انفرادی تصور باقی رہے گا۔ وہاں اسلامی حکومت کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ اور ہماری پیشوائیت چونکہ انفرادی عبادت کی قائل ہے' اس لئے انہیں اسلامی حکومت کی ضرورت نہیں رہتی۔ البتہ طلوع اسلام کے لئے اسلامی حکومت ایک ضروری Requisite ہے۔ اس حکومت کے ہر حکم کی اطاعت عبادت کا درجہ رکھتی ہے۔ (اسلامی حکومت میں) جب آپ کسی چوراہے پر ٹریفک کے سپاہی کے حکم کی اطاعت کریں گے' تو وہ اطاعت عبادتِ خداوندی کے مرادف ہوگی۔ چوراہے کا وہ سپاہی اس اسلامی حکومت کا نمائندہ ہے جو قرآن کریم کے قوانین و احکام نافذ کر رہی ہے' اس لئے اس سپاہی کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت اور عبادتِ الٰہی ہے۔ مذہب میں اطاعت خداوندی کا یہ تصور نہیں ہے۔ یہ خالص دینی تصور ہے۔ اور دین صرف اسلام ہے۔ باقی سب مذاہب ہیں۔ یہ جو ہمارے علماء کرام ادیانِ عالم کے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور تقابلِ ادیان ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے' تو یہ بھی قرآن کے خلاف ہے۔ برصغیر ہندو پاک میں انگریزوں کی حکومت کے قیام کے بعد' ہمارے علماء کرام انگریز پادریوں سے مناظرے کرتے تھے۔ عیسائیت پر اسلام کی فوقیت و برتری کو ثابت کرتے تھے تو یہ بھی ''حدیث بے خبراں'' ہی تھی۔ عیسائیت تو خود صرف مذہب ہونے کی مدعی ہے۔ وہ دین ہونے کا دعویٰ ہی نہیں کرتی۔ عیسائیت اور اسلام' یا دوسرے الفاظ میں مذہب کا دین سے تقابل کرنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ ہمارے ان جلیل القدر علماء کرام کے سامنے خود اسلام بھی صرف مذہب ہی تھا' وہ خود بھی اسلام کو دین نہیں سمجھتے تھے۔

اسلامی حکومت کے قیام کی فرضیت اور اس کے وجوب کے بارے میں کمترین کی کتاب ''روایتی و قرآنی دین کے فاصلے'' طبع ہوئی ہے جو بلا قیمت تقسیم کی جا رہی ہے۔ اس کتاب میں اسلامی حکومت کی امتیازی خصوصیات کو نہایت وضاحت سے قرآنی آیات کے حوالے دے کر تحریر کر دیا گیا ہے۔ اس لئے اس مختصر سے مضمون میں ان خصوصیات کے صرف حوالے دیئے جاتے ہیں۔ جن حضرات کو اس مضمون سے دلچسپی ہو وہ اس کتاب کو ملاحظہ فرمالیں۔

اسلامی حکومت کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ قرآن کریم نے جو وعدے اور نتائج اپنے نظام سے برآمد ہونے کے' کئے ہیں' وہ نظام ان وعدوں کو پورا کرتا ہے۔

اگر کوئی اسلامی حکومت وہ وعدے پورے نہیں کرتی تو وہ اسلامی حکومت نہیں ہوسکتی۔ اسلامی حکومت مومنین کو اقتدار و تمکن عطا کرتی ہے (۲۴/۵۵) ہر ہر فرد کو رزق فراہم کرتی ہے (۶/۱۱، ۶/۱۵۱) اس نظام کی وجہ سے مرکز اور مومنین کو غلبہ حاصل ہوتا ہے (۸/۶۳، ۲/۵۸) یہ نظام مومنین کو وہ قوت عطا کرتا ہے، کہ دنیا میں مومنین پر کافر کو غلبہ حاصل نہیں ہو سکتا (۴/۱۴۱)، یہ ساری دنیا کے نگران ہوتے ہیں (۲/۱۴۳)۔

(۲) اس سے بڑا شرف انسان کے تصور میں نہیں آ سکتا کہ اللہ تعالیٰ اس حکومت کے کاموں کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ (۱۷/۸، ۱۴/۹)۔

(۳) اس مملکت میں کوئی فرقہ بندی یا پارٹی بازی نہیں ہوتی۔ مرکز سے احکامات جاری ہوں گے پوری قوم ان احکامات کی اطاعت کرے گی۔ اس میں پرسنل لاء اور پرائیویٹ لاء کی تفریق نہیں ہوتی کیونکہ انسان کی پوری زندگی قانون خداوندی کے تابع ہوتی ہے۔

(۴) اس نظام میں لوگوں کی دعائیں، اسلامی حکومت کی معرفت پوری ہوتی ہیں۔ جیسا کہ حضرت عمر فاروقؓ کا مشہور قول ہے کہ میں تمہاری دعائیں خدا تک پہنچنے سے روکنے کے لئے یہاں بیٹھا ہوں۔ کیونکہ تمہاری ہر دعا میرے خلاف شکایت کے مرادف ہے۔

(۵) اس نظام کی معرفت ہی لوگوں کی غلطیوں کا ازالہ ہوتا ہے، اور اسی نظام کی معرفت توبہ قبول ہوتی ہے (۴/۶۴)۔

تحریک طلوع اسلام کا جو موقف حدیث کے بارے میں ہے۔ ہماری پیشوائیت نے اس کو بھی درست طور پر نہیں سمجھا اور اس کو مزید الجھانے کی کوشش کی اور اس تحریک کو انکار حدیث سے متہم کیا۔ حالانکہ طلوع اسلام نے کبھی حدیث سے انکار نہیں کیا۔ مدتوں اس کے ٹائٹل پیج پر حدیث تحریر کی جاتی تھی، جن حضرات نے طلوع اسلام کنونشن میں شرکت فرمائی ہے وہ اس بات کے شاہد ہیں کہ کنونشن کے پنڈال میں ایک طرف آیۂ کریمہ اور دوسری طرف حدیث کے بینرز (Banners) آویزاں ہوتے تھے اور ایک بینر پر یہ حدیث شریف تحریر تھی ومن استوىٰ يوماه، فهو مغبون، جو اپنی درخشندگی سے اس بات کی دلیل ہے کہ یہ ضرور حضورﷺ کا قول ہوگا۔

طلوع اسلام حدیث کا منکر نہیں ہے۔ اس کے نزدیک ہر وہ حدیث جو قرآن کے مطابق ہے وہ درست ہے اور ہمارے سر آنکھوں پر۔ لیکن ہر وہ حدیث جو قرآن کے خلاف ہے وہ قابل قبول نہیں ہے خواہ اسناد کے اعتبار سے وہ کتنی ہی قوی کیوں نہ ہو۔ اور ''صحیحین'' میں بھی درج ہو۔ اگر وہ قرآن کے خلاف ہے وہ حدیث درست نہیں ہے۔ تاہم وہ احادیث بھی جو درست بھی ہیں اور قرآن کے مطابق بھی ہیں پھر بھی وہ وحی نہیں ہوتیں، وحی صرف قرآن

میں ہے۔ خارج از قرآن وحی کا تصور باطل ہے۔ لیکن افسوس کہ ہمارے علمائے کرام حدیث کو بھی وحی الٰہی اور قرآن کی مثل قرار دیتے ہیں۔ چونکہ یہ نظریہ قرآن کے خلاف ہے' اس لئے طلوع اسلام اس نظریہ کی تصویب نہیں کرتا' حدیث کو وحی ماننے کا نظریہ امت مسلمہ میں متفق علیہ ہے اور ہزار سال سے مسلمان اسی نظریہ پر قائم ہیں' لیکن افسوس کہ یہ نظریہ بالکل خلافِ قرآن ہے۔ ''وحی صرف قرآن میں ہے''۔ یہ نظریہ صرف طلوع اسلام کا ہے مسلمانوں میں کوئی فرقہ بھی اس کا قائل نہیں رہا۔ اس بارے میں راقم سطور کے ۸ مضامین طلوع اسلام میں شائع ہوئے ہیں۔ جن میں آیات قرآنی کے حوالے دیئے گئے ہیں۔ چونکہ آیات قرآنی کے حوالے ہر جگہ قارئین نہیں دے سکتے' اس لئے چند احباب کے حکم پر اس نظریہ کی تائید میں صرف عقلی دلائل پیش خدمت کئے جاتے ہیں' جن حضرات کو اس مسئلہ میں دلچسپی ہو' وہ طلوع اسلام میں طبع شدہ مضامین ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ وحی صرف قرآن میں ہونے کے چند عقلی دلائل ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) ہمارے علماء کرام قرآن کو بھی وحی قرار دیتے ہیں' اور حدیث کو بھی وحی شمار کرتے ہیں۔ اگر یہ دونوں چیزیں' قرآن وحدیث' وحی ہیں تو حضورﷺ کے اپنے ذاتی اقوال جو ان کے غور وفکر کا نتیجہ ہوتے تھے وہ کون سے ہیں؟ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے' میرا راستہ یہ ہے کہ میں دلائل کے ساتھ اللہ کی طرف بلاتا ہوں (۱۲/۱۰۸)۔ حضورﷺ جو دلائل دیتے تھے وہ ان کی سوچ کا نتیجہ ہوتے تھے وہ وحی نہیں ہو سکتے تھے لیکن اگر علماء کا یہ متفق علیہ نظریہ تسلیم کر لیا جائے کہ حدیث بھی وحی ہے' تو حضورﷺ کا اپنا کوئی قول باقی نہیں رہتا۔

(۲) ہمارے علمائے کرام رسول اللہ کی اطاعت حدیث کے ذریعے کرتے ہیں۔ ان کا یہ موقف ہے کہ قرآن سے اللہ کی اطاعت ہوتی ہے اور حدیث سے حضورﷺ کی اطاعت ہوتی ہے۔ اگر قرآن و حدیث دونوں وحی ہیں تو یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک وحی (قرآن) سے تو اللہ کی اطاعت ہوتی ہے اور دوسری وحی (حدیث) سے رسول اللہ کی اطاعت اگر بقول علماء کرام' احادیث بھی وحی ہیں تو ان کی اطاعت سے بھی اللہ ہی کی اطاعت ہوگی رسول اللہ کی اطاعت نہیں ہوسکتی۔ پھر علماء کرام کو رسول اللہ کی اطاعت کرنے کا کوئی اور ذریعہ تلاش کرنا ہوگا۔

(۳) ہمارے علماء کرام سورۃ النجم کی آیۂ کریمہ 'وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ (۵۳/۳۔۴) (ترجمہ) رسول تو اپنی خواہش سے بولتا ہی نہیں یہ تو صرف وحی ہے جو بھیجی جاتی ہے۔ سے دلیل دیتے ہیں کہ مطلق نطق رسول وحی ہے۔ اس لئے احادیث جو اقوال رسول ہوتی ہیں وہ سب وحی ہیں لیکن احادیث کے

موجودہ ذخیرے' بشمول صحاح ستہ' حدیث ہی نہیں ہیں۔ یہ تو صرف روایات ہیں۔ ان کو حدیث یا قول رسول کہنا ہی غلط ہے۔ ہمارے علماء کرام خود اس بات کے قائل ہیں کہ احادیث بالمعنی روایت کی گئی ہیں اور یہ الفاظ رسول اللہ کے نہیں ہیں بلکہ یہ الفاظ رواۃ کے ہیں۔ اس کی عملی صورت یہ ہوتی تھی کہ ایک مضمون حضورﷺ نے ارشاد فرما دیا۔ اسی مضمون کو پہلا راوی اپنے الفاظ میں دوسرے راوی کو سنا دیتا (روایت کر دیتا) تھا۔ اسی طرح دوسرا تیسرے کو اور تیسرا چوتھے کو' الفاظ صرف رواہ کے ہوتے تھے۔ جو مضمون کو منتقل کرتے رہتے تھے۔ ان کا حضورﷺ کے قول سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ رواۃ کے یہ الفاظ کس طرح وحی ہو سکتے ہیں؟۔ نیز یہ کہ ہر روایت کے شروع میں لکھا جاتا ہے **قال رسول اللہ** اور اس کے آخر میں ہوتا ہے **او کما قال علیہ السلام**' یعنی جیسا بھی حضورﷺ نے فرمایا اس **کما قال علیہ السلام** کہنے سے حدیث کا سارا ذخیرہ خود بخود ظنی بن جاتا ہے؟ یہ عقیدہ کہ روایات جو راویوں کے الفاظ ہیں' وحی ہیں اس قدر بودا اور کمزور ہے کہ غور و فکر کی کسوٹی پر ایک منٹ کے لئے بھی نہیں ٹھہر سکتا۔ لیکن حیرت ہے کہ اس نظریہ پر ہمارے علماء کرام ایک ہزار سال سے جم کے کھڑے ہیں اور کوئی اس عقیدہ کی کمزوری پر توجہ نہیں کرتا۔ برسبیل تنزل اگر یہ بات فرض بھی کر لی جائے کہ ہر نطق رسول (قول رسول) وحی ہے تو یہ روایات تو قول رسول یعنی نطق ہی نہیں ہیں۔ یہ تو راویوں کے الفاظ ہیں۔ راویوں کے الفاظ کس طرح وحی ہو سکتے ہیں۔ ہمارے علماء کرام نے وحی کی اہمیت و قدر کا اندازہ ہی نہیں کیا۔ وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ (۶/۹۱)۔

(۴) اگر حدیث بھی وحی تھی' تو حضور کا فرض تھا کہ وہ اس کو بھی قرآن کی طرح محفوظ بنا کر امت کو دے کر جاتے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لیا رسول اللہﷺ نے اس کی حفاظت کا اہتمام فرمایا لیکن احادیث کی حفاظت کا ذمہ نہ تو خدا نے لیا اور نہ ہی کوئی ذخیرہ احادیث کا جمع کر کے' حضورﷺ نے چھوڑا۔ یہ کام امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ وغیرہ نے انجام دیا اور اس طرح انہوں نے وہ کام سرانجام دیا جو خود حضورﷺ کو کرنا چاہئے تھا۔ لہٰذا ایک طرح سے وہ کارِ رسالت میں برابر کے شریک دیئے جاتے ہیں۔

ہمارے ہاں قرآن کریم کی تفاسیر جب تحریر ہونی شروع ہوئیں تو اس سے پیشتر اصول تفسیر طے ہی نہیں کئے گئے۔ ہر مفسر نے اپنے مزاج اور عقیدہ کے مطابق تفسیر تحریر کرنی شروع کر دی۔ قرآن کریم نے تفسیر کرنے کے اصول خود بیان فرما دیئے تھے۔ جن سے قرآن فہمی بہت آسان ہو جاتی ہے اور قرآن کریم خود آپ سے بولنے لگتا ہے۔ افسوس کہ ہمارے مفسرین نے ان اصولوں کو قابل اعتناء نہیں سمجھا اور ان کو بالکل نظرانداز کر دیا۔ جس کا نتیجہ ظاہر

ہے کہ ہماری تفاسیر میں مشکل سے پانچ فیصد نظریات قرآن کے ہوتے ہیں اور باقی خارج از قرآن نظریات تفاسیر میں داخل کر دیئے گئے ہیں، لیکن طلوع اسلام نے قرآن کی تفسیر خود قرآن کے بیان کردہ اصولوں کے مطابق کر کے، قرآن فہمی کے لئے راستے وا کر دیئے۔ یہ موضوع طویل ہے جو حضرات اس پر غور کرنا چاہیں وہ راقم سطور کی مرتبہ کتاب ''قرآن فہمی کے قرآنی اصول'' ملاحظہ فرمالیں۔ کیونکہ ایک ہی موضوع پر بار بار تحریر کرنے سے قارئین کرام کا وقت ضائع کرنا ہے۔

اب مسلمانوں کے سامنے صرف ایک راستہ ہے کہ وہ خالص قرآنی تعلیم پر عمل کرتے ہوئے دین کا نظام قائم کریں کہ اسی نظام سے ان کا عروج و زوال وابستہ ہے۔ اسی نظام کے ذریعے وہ عبادت خداوندی کر سکتے ہیں اور اسی نظام کے قیام کے بعد وہ حلال کا لقمہ کھا سکتے ہیں ورنہ اس نظام کی عدم موجودگی میں نہ تو وہ اللہ کی عبادت کر سکتے ہیں اور نہ ہی حلال کا لقمہ کھا سکتے ہیں۔ فی الحال ان کا کمایا ہوا ایک ایک لقمہ حرام ہے۔

مسلمانوں کی قسمت یاوری کرتی تو ہمارے علماء کرام اس خالص قرآنی تحریک کی حمایت کرتے اور اس کا دل و جان سے ساتھ دیتے لیکن ہمارے علماء کرام کی تو دنیا ہی نرالی ہے وہ اس کی حمایت تو کیا کرتے ان کی کیفیت تو اس تحریک کی مخالفت میں یہ ہے کہ ؎

سنگ ہر شخص نے ہاتھوں میں اٹھا رکھا ہے

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غلام باری، مانچسٹر

قرآن پر کون لوگ ایمان لائیں گے؟

نماز و روزہ کی آزادی و ادائیگی بجا اور درست لیکن اسلامی زندگی، اسلامی نظام یعنی خدا کے عطا کردہ ''اجتماعی نظامِ زندگی'' کے تابع بسر کی جایا کرتی ہے۔ عصرِ حاضر کے مسلمانوں میں مروجہ اسلام فقہی ائمہ حضرات کے وضع کردہ اربعہ مذاہب کی بنیاد قرآن کے بجائے روایات Tradition/Narration پر مبنی (Based on) ہے جس کی عمارت اسلاف کی اندھی تقلید Blind Faith پر استوار ہے۔ آج کل اخبارات، میگزین اور ٹی۔ وی چینلوں کے ذریعے بڑے زور شور سے اسی کا پرچار کروایا جاتا ہے جس کا دینِ اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ ہم بزعمِ خویش اہلِ سنت والجماعت کہلانے والے دیّن کے بجائے امام ابوحنیفہؒ کے بنائے ہوئے مذہب پر چلتے ہیں۔ (آپ کو کنزالایمان میں حاشیہ پر لکھا ہوا ملے گا یہ امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے)۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے کی بات ہے گاؤں میں سکھ تھانیدار نے ایک انگوٹھا چھاپ بوڑھے سے پوچھا! اوئے پھتیا توں کیدے دین تے چلدا ایں۔ جواب سنئے اور اسلام کے قلعہ میں رہنے والے ہمارے مسلمان مذہبی لیڈروں، ائمہ مساجد، صحافیوں، دانشوروں اور کالم نویسوں کی عقل کا اندازہ لگایئے جنہوں نے کبھی بھولے سے بھی اللہ کے دین (نظام) کا نام تک نہیں لیا اور ملٹری حکومت پر قانع اور انسانوں کے وضع کردہ نظامِ جمہوریت کے پیچھے لگے ہیں۔ پورے ملک سے بے نیاز اپنے گاؤں کو سارا جہان سمجھتے ہوئے سچ بولنے والا بوڑھا کاشتکار کہنے لگا جی پہلے شاہ دین نمبردار تھا اس کے دین پر چلتے تھے اور اب اس کے بیٹے شہنواز کے دین پر چلتے ہیں۔

☆ قرآن کریم کی آیات کو وہی شخص سمجھے گا جو اپنے ذہن سے ہر قسم کے بتوں کو نکال باہر کر کے اس کی طرف آئے گا۔ سورۃ الواقعہ میں اللہ کا ارشاد ہے: لَّا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ (۵۶/۷۹)۔ قرآن کے حقائق سے وہی لوگ صحیح معنوں میں مطلع ہو سکتے ہیں جنہیں قلب و نظر کی پاکیزگی نصیب ہو۔ (اس سے بہرہ یاب ہونے کے لئے تطہیرِ قلب و نظر ضروری ہے۔ یعنی اگر انسان پہلے سے کچھ خیالات ذہن میں رکھ کر یا جذبات سے مغلوب ہو کر قرآن کا مطالعہ کرے تو وہ اس سے مستفیض نہیں ہو سکے گا۔ اس

کے لئے ضروری ہے کہ وہ خالی الذہن ہو کر اور جذبات سے الگ ہٹ کر قرآن کو سمجھنے کی کوشش کرے)۔ لہٰذا پاکبازوں کے سوا کسی کو قرآن سے مَس نہیں ہو سکتا۔ (مَس کے معنی ٹچ ہی نہیں حقائق سے باخبر ہونا بھی ہیں)۔

☆ سورۃ الکہف میں ہے کہ: وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ هَذَا الْقُرْآنِ لِلنَّاسِ مِن كُلِّ مَثَلٍ وَكَانَ الْإِنسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلاً (۱۸/۵۴)۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم میں ہر معاملہ کے متعلق بات واضح طور پر بار بار کہہ دی گئی ہے لیکن اس سے راہنمائی حاصل کرنے کا طریق یہ ہے کہ انسان اس ذہنیت کو لے کر قرآن کی طرف نہ آئے کہ مجھے بہرحال اپنی بات پر اڑے رہنا اور قرآن کو شکست دینا ہے۔ وہ خالی الذہن ہو کر قرآن حکیم پر غور و فکر کرے اور مقصد پیشِ نظر یہ رکھے کہ مجھے حق اور صداقت کو تلاش کرنا ہے۔ اس طرح قرآن مجید سے صحیح راہنمائی مل جائے گی۔

☆ دوسری اہم بات یہ کہ جو خود غور و تدبر کریں گے (۲۴/۴۷)۔ اور اسلاف پرستی یعنی تقلیدِ اسلاف چھوڑ کر قرآن کریم کی طرف آئیں گے وہ لوگ اس دستورِ حیات پر ایمان لائیں گے (۲/۱۷۰)، (۵/۱۰۴)، (۲۱/۳۱)۔ ایسے لوگ قرآن کریم کے بعد کسی اور کے حکم و خیالات کا اتباع جائز نہیں سمجھیں گے (۱۳/۳۷)۔

☆ سب سے اہم ترین بات یہ ہے کہ قرآن کریم کو تصریفِ آیات کی رو سے ''قرآن کی تفسیر بذریعہ قرآن'' سمجھنے والے اس کتابِ عظیم پر ایمان لائیں گے۔ روایات کے ذریعے نہیں۔ سورۃ الفرقان میں زندگی بخش قانونِ کائنات سامنے لانے کے بعد اللہ کا ارشاد ہے: وَلَقَدْ صَرَّفْنَاهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوا فَأَبَى أَكْثَرُ النَّاسِ إِلَّا كُفُوراً (۲۵/۵۰)۔ ہم اپنے قانونِ کائنات کو مختلف پیراؤں میں (بار بار) پیش کرتے ہیں تاکہ یہ لوگ اس حقیقت کو سمجھ سکیں (کہ جب کائنات کی ہر شئے قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتی ہے اور اس سے اس قدر تعمیری نتائج مرتب ہوتے ہیں، تو اگر انسان بھی اس کے قوانین کے مطابق چلے تو اس کی زندگی بھی خوشگواریوں کی حامل ہو جائے۔ لیکن اس کے باوجود) اکثر لوگوں کا حال یہ ہے کہ انہیں قوانینِ خداوندی سے انکار اور سرکشی کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں۔

☆ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے کہ: وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هَـذَا الْقُرْآنِ مِن كُلِّ مَثَلٍ فَأَبَى أَكْثَرُ النَّاسِ إِلَّا كُفُوراً (۱۷/۸۹)۔ ہم مختلف امور کو لوٹا لوٹا کر بیان کرتے ہیں۔ ان کے متنوع گوشے سامنے لاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اکثر لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ ضد اور تعصب کی بنا پر بلا سوچے سمجھے اس سے انکار کئے جاتے ہیں۔

☆ سورۃ الانعام میں اللہ کے دیدار یعنی معرفت کی نفی کے بعد ہے: وَكَذَلِكَ نُصَرِّفُ الآيَاتِ وَلِيَقُولُوا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهُ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ (۶/۱۰۵)۔ (اے رسول ﷺ! تم ان سے کہہ دو کہ تم سے مطالبہ ذاتِ خداوندی کی کنہ و حقیقت تک پہنچنے کا نہیں۔ مطالبہ اس کے قوانین کی اطاعت کا ہے)۔ اور اس طرح ہم اپنے قوانین کے مختلف پہلوؤں کو بار بار (تصریفِ آیات سے) سامنے

لاتے رہتے ہیں تاکہ یہ تسلیم کرلیں کہ تم نے انہیں نہایت دلنشیں انداز سے بیان کر دیا ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ ان قوانین کی حقیقت و اہمیت انہی پر واضح ہو سکے گی جو علم و بصیرت سے کام لیں گے۔

☆ ایک اور مقام پر ہے: وَكَذَلِكَ أَنزَلْنَاهُ قُرْآناً عَرَبِيّاً وَصَرَّفْنَا فِيهِ مِنَ الْوَعِيدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ أَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرا (۲۰/۱۱۳)۔ ہم نے اس قرآن کو اس قدر واضح انداز میں نازل کیا ہے اور اس میں مختلف انداز سے زندگی کی غلط روش کے نتائج وعواقب کو لوٹا لوٹا کر بیان کر دیا ہے تاکہ لوگ اس سے بچ کر چلیں اور (اقوامِ سابقہ کی تاریخی سرگزشتیں جو اس میں بیان ہوئی ہیں ان سے) ان کی سمجھنے کی صلاحیتیں بیدار ہوں اور انہیں سرفرازی و سربلندی عطا ہو جائے۔ انہیں شرف و مجد حاصل ہو جائے۔

☆ صرف ایک لفظ ذکر پر غور کیجئے جو مندرجہ بالا آیت کریمہ کے آخر میں آیا ہے۔ پھر روایت کی رو سے شہیدوں سے بھی بلند درجات حاصل کرنے کی خاطر اپنے ہاں اس کے استعمال سے مزاجِ خانقاہی کی ملمع کاریوں سے اقوام عالم میں امتِ مسلمہ کی ذلت و رسوائی کا اندازہ لگائیے۔ ذکر کے معنی یاد کرنا' پیشِ نظر رکھنا' قانون خداوندی اور شرف و مجد کے ہیں۔ قرآن کریم قوانینِ خداوندی کا مجموعہ ہے اس لئے اسے ذکر کہا گیا ہے۔ (کمرے میں اندھیرا طاری کر کے کلمہ طیب کے اجزا سے دل پر ہوحق کی ضربیں لگانے کی محفل جمانے کا حکم قرآن میں کہیں نہیں ہے)۔ اللہ کا ارشاد ہے: لَقَدْ أَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ كِتَاباً فِيهِ ذِكْرُكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (۲۱/۱۰)۔ ہم نے تمہاری طرف یہ ضابطہ قوانین نازل کیا ہے۔ اس میں خود تمہارے شرف و عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔ اگر تم ذرا عقل و بصیرت سے کام لے کر سمجھنے کی کوشش کرو (تو یہ حقیقت تم پر واشگاف ہو جائے گی کہ یہ ضابطہ قوانین تمہیں سرفرازیاں اور سربلندیاں عطا کرنے کے لئے دیا گیا ہے۔ اس سے خدا نے کوئی اپنا مقصد حاصل نہیں کرنا)۔ بَلْ أَتَيْنَاهُم بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَن ذِكْرِهِم مُّعْرِضُونَ (۲۳/۷۱)۔ ذرا ان لوگوں کی عقل کو دیکھو!) ہم ان کے پاس' ان کی بڑائی اور عظمت' شرف و مجد' سرفرازی و سربلندی کا سامان لے کر آئے ہیں اور ان کی یہ حالت ہے کہ یہ اس عظمت و سرفرازی سے منہ موڑ رہے ہیں۔ یہ اس لئے کہ اکیلے قرآن کی بات سے ان کے اپنے ذاتی مفادات پر زد پڑتی ہے۔ لیکن وَإِذَا ذُكِرَ الَّذِينَ مِن دُونِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ خدا سے ورے جب اور لوگوں (فقہا عظام' ائمہ کرام' شیخ الاحادیث' وعلیٰ ھذا القیاس) کا ذکر کیا جائے تو خوشی سے ان کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔ قرآن کہتا ہے: وَلَذِكْرُ اللَّهِ أَكْبَرُ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُونَ (۲۹/۴۵)۔ اللہ کا ضابطہ قوانین بلند و بالا ہے اور اللہ تمہارے خود ساختہ آئین و حدود آرڈیننس وغیرہ کو جانتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر انعام الحق

تبصرہ بمقالہ ''حلالہ'' بابت اشاعت طلوع اسلام لاہور

ستمبر 2006ء از خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی

انہی دنوں بزمِ طلوع اسلام پنڈی کے ایک رکن نے میری توجہ درج بالا مقالہ کی طرف مبذول کراتے ہوئے اصرار کیا کہ اس میں فکرِ پرویز کو بھی علمائے کرام کی معیت میں قرآن کریم کے خلاف قرار دیا گیا' لہٰذا اس کا جائزہ لیا جائے۔ فاضل مصنف کے نام سے' فاضل درسِ نظامی کی اضافت سے کسی باریش اور دیندار بزرگ کا تصور سامنے آ رہا تھا۔ لہٰذا میرا پہلا ردعمل اظہارِ معذرت کی صورت میں تھا۔ میں دیانتداری سے ایسے بزرگ حضرات کی بہت عزت کرتا ہوں' جس کے احترام میں کبھی منطقی انداز میں ان سے گفتگو میں احتراز ہی کیا۔

میری یہ دیرینہ خواہش رہی ہے کہ مجھے کہیں سے علمی مواد دستیاب ہو سکے جو تحقیقی اور تنقیدی اصولوں کے مطابق ہو اور جس سے فکرِ پرویز سے اختلاف کرنے میں مدد حاصل ہو سکے۔ اس لئے اس مضمون کی طرف توجہ کی تو بادی النظر اسے بھی سطحی ہی پایا۔ حسن اتفاق سے فاضل مصنف کی آمد پر ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہو گیا اور ان کی شخصیت میں انسیت محسوس ہوئی۔ اسی ملاقات میں بزم کے ارکان مین ان کے مقالے سے ملے جلے تاثرات کی وجہ سے بے چینی کا احساس بھی ہوا۔

ان کے مقالہ کے ضمن میں میری طرف سے چند وضاحتیں مانگنے پر' انہوں نے ان کو تحریری طور پر متعلقہ ایڈیٹر کے تواسطت سے حاصل کرنے کا مشورہ دیا۔ لہٰذا ان کے مثبت مشورہ اور اراکینِ بزم کی خواہش نے مجھے آمادہ کیا کہ میں یہ مشق کروں۔

مقالہ میں فاضل مصنف نے حلالہ کے مروجہ تصور کو علمائے کرام (بشمول پرویز) سورہ بقرہ کی آیت 2:230 درج کر کے ان سے نتائج کے اخذ کرنے میں لغزش کھاتے ہوئے خلافِ قرآن کریم جانے کو پیش کیا ہے۔

فان طلقها فلا تحل له من بقد حتى تنلع زوجا غيره فان طلقها خلا جناح عليهما ان يتراجعا۔

(ترجمہ فاضل مصنف کا درج کردہ) پھر اگر تیسری بار بھی عورت کو طلاق (بائنہ) دے تو اس کے بعد

جب تک وہ دوسرے مرد سے نکاح نہ کرے۔ اس کے لئے حلال نہیں ہاں اگر دوسرا شوہر (نکاح کے بعد) اس کو طلاق دے دے تب البتہ ان میاں بیوی پر باہم میل کر لینے میں کوئی گناہ نہیں۔

میرے خیال میں فاضل مصنف نے اس آیت کی وضاحت میں سب سے پہلے جو ٹھوکر کھائی ہے وہ ان کا نکاح میں ہم بستری کو لازماً شامل ہونا بتایا ہے۔ اس کے لئے دلائل میں وہ تفسیری کلام اور روایات کا حوالہ دیتے ہوئے نکاح کے لفظ کو عقد نکاح ہی کے معنوں میں لئے جانے پر اختلاف کرتے ہیں۔

فاضل مصنف سے البتہ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ وہ پرویز صاحب سے اس بات میں پوری طرح متفق ہیں کہ قرآن کریم کو عربی زبان اور تصریفِ آیات کی رو سے سمجھنا چاہئے اور اس پر خارجی عناصر کو اثر انداز نہیں ہونے دینا چاہئے۔ لہٰذا ہمارا ان اصولوں کے تحت تبصرہ ان کے لئے نہ صرف قابلِ قبول بلکہ موثر ہونے کی صورت میں ان کے موقف میں مناسب ترمیم کا موجب بھی ہوسکتا ہے۔

اس لئے تبصرہ کا آغاز نکاح کے لغوی مفہوم کی تلاش سے کیا جاتا ہے۔ راغب اصفہانی نے نکاح کا مطلب سمجھانے میں وضاحت سے کام لیا ہے۔ کہ اصل میں نکاح بمعنی عقد آتا ہے اور بطور استعارہ جماع کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ (اکٹھا نہیں) یہ ناممکن ہے کہ یہ اصل میں بمعنی جماع ہو اور پھر عقد میں بطور استعارہ شامل ہوا ہو۔ کیوں کہ عربی زبان میں جماع کے معنی میں تمام الفاظ کنائی ہیں۔ کیونکہ نفس فعل کی طرح صراحتاً اس کا تذکرہ بھی مکروہ سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ نہیں ہوسکا کہ جو زبان ذکرِ فحش سے اس قدر گریزاں ہو وہ ایک مستحسن امر کے لئے قبیح لفظ استعمال کرے۔

قرآن کریم میں بھی نکاح کے لئے سورہ بقرہ کی آیت 235 میں عقدۃ النکاح کے الفاظ لائے گئے ہیں۔ لہٰذا قرآن کے تصور کی رو سے نکاح نام ہے باہمی معاہدے کے تحت اس کی سورہ نساء کی آیت 24 کا مقصد لئے ہوئے ہو۔ وہ مقصد یا معاہدہ یہ صورت لئے ہوتا ہے کہ وہ محصنین غیر مسٰفحین ہوتا ہے۔ قرآن کا انداز بڑا بلیغ ہے کہ اس نے یہاں ایک بات کی وضاحت اس کی متضاد بات کو سامنے رکھ کر پیش کر دی ہے۔ یہاں مسافحین کے معنی ہوں گے' مادہ منویہ کو بہا دینے کے لئے (مصنف کی درج روایات کی رو سے مزا چکھنے کے)۔ لہٰذا ایسے نکاح سے مقصود محض جذبہ شہوانی کی لازمی تسکین ہو' قرآن کریم کی رو سے نکاح کے تصور میں جگہ نہیں پاتی۔ اگر کسی شخص کا یہ خیال ہو کہ قرآن شریف کے الفاظ سے اس مسئلہ کی تائید لائی جاسکتی ہے تو وہ اصول قرآنی سے بے خبر ہے۔ قرآن شریف کی رو سے نکاح سے سورہ الاحزاب کی آیت 49 میں ثم طلقتموھن من قبل ان تمسوھن (پھر ان کو چھوڑ دو (طلاق دے دو) پہلے اس سے کہ ان کو ہاتھ لگاؤ) کی صورت کی وضاحت ملتی ہے اس

میں مباشرت تو دور کی بات ہے بغیر چھونے کے طلاق اور نکاح ہونے کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ نکاح میں جبر اور ملکیت کا کہیں بھی عمل دخل نہیں ہوتا۔ اسی لئے مردوں کے لئے ممانعت ہے کہ وہ

یایھا الذین امنوا لا یحل لکم ان ترثوا النساء کرھاً۔

اے ایمان والو! تمہارے لئے یہ جائز ہی نہیں کہ تم زبردستی عورتوں کے مالک بن جاؤ۔

نکاح عارضی نہیں ہوسکتا۔ یہ زندگی بھر کے لئے مرد وعورت کی رضامندی سے معاہدہ ہوتا ہے۔ اس میں حلالہ کے مروجہ لعنتی طریق کو کسی کی طرف منسوب کرنا اور وہ بھی قرآنی آیت سے استنباط کرتے ہوئے ناقابلِ تصور ہے۔ یہ صریح زناکاری ہے اور ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کو اسی تناظر میں دور کرنے کے لئے پورا زور لگائے۔

فاضل مصنف کا اصرار کہ وہ نکاح میں مباشرت لازم طور پر شامل کرنے پر تلے ہوئے ہیں' قرآن کے لغوی اور اس کی اپنی وضاحت سے مطابقت نہیں رکھتا۔ یہ تشویش کی بات ہے لیکن اس آیت کے دوسرے حصہ سے جہاں فان طلقھا سے ابتدا ہوتی ہے۔ یہ قریباً فتویٰ دے دینا کہ اس کے بعد وہ عورت پہلے شوہر کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حرام ہوگی' ناقابلِ معافی جرم کے زمرے ہی میں شمار ہو گا' جب تک کہ اس کی سند میں قرآن سے مستند دلائل حاصل نہ ہوں۔ فاضل مصنف نے یہاں عربی گرائمر کی روشنی میں یہاں لفظ ''حتی'' کو سَببیہ میں استعمال کر کے بہت بڑی جسارت کی ہے۔ قرآن کی رو سے جن حرام رشتوں کے نام اللہ نے قرآن میں گنوائے ہیں۔ ان کے بعد وضاحت کر دی کہ

واحل لکم ماوراء ذلکم (النساء 4:24)۔

ان عورتوں کے علاوہ' اور سب تمہارے لئے حلال ہیں۔

لہٰذا عربی گرائمر سے دلیل لانا اور وہ بھی نہایت کمزور کم از کم میں تو مصنف کی شخصیت سے توقع نہیں رکھ سکتا کہ وہ حلال کو حرام بنانے کا مرتکب ہو۔

اس آیت میں ''حتی'' کے بعد فعل مضارع تنکح کا استعمال کیا گیا ہے۔ عربی گرائمر کی رو سے فعل مضارع سے پہلے ''حتی'' کے جملے کا استعمال تین معانی پر دلالت کرتا ہے۔

(الف) غائیہ

(ب) سببیہ

(ج) استثناء۔

(الف) غائیہ کے ذریعے انتہائے غایت تک یکبارگی سے نہیں بلکہ اکثر و بیشتر بتدریج اور مرحلہ وار پہنچا جاتا ہے۔ حتّٰی غائیہ کا مابعد اسم اس کے ماقبل اسم کے حکم میں داخل ہوتا ہے۔ (اِلٰی کے برعکس) یہ اس وقت تک ہوتا ہے جب تک اس کے خلاف کوئی قرینہ موجود نہ ہو۔ البتہ اس کا مابعد اسم کا

ماقبل اسم کا جزو ہونا ضروری نہیں۔ یہ قسم عام طور پر استعمال ہوتی ہے اور اس کا اردو میں ترجمہ ''تک اور جہاں تک'' کیا جاتا ہے جیسا کہ زیرتبصرہ آیت میں فاضل مصنف کے علاوہ دوسرے علمائے کرام بشمول پرویز نے کیا ہے۔

(ب) سببیہ (تعلیل) جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس سے سبب اور علت کے دریافت ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ اس میں لام تعلیل کے برعکس حتی کا ماقبل سبب ہوتا ہے اس کے مابعد کا۔ یہ ترتیب لام تعلیل کی ترکیب کے برعکس ہے کیونکہ لام کا مابعد سبب ہوتا ہے اس کے ماقبل کا۔ اگر غائیہ کے حق میں حتی کے لئے قرائن نہ پائے جائیں بلکہ سببیہ کے حق میں ہوں' تو پھر اس کا استعمال ہوتا ہے۔ اس کا اردو میں ترجمہ اس سبب سے کیا جاتا ہے کہ جیسا کہ فاضل مصنف نے زیر تبصرہ آیت میں کئے ہیں۔

(ج) استثناء: اگر پہلے دو معانی پر دلالت نہ کرے تو یہ استثناء پر دلالت کرتا ہے۔ زیرتبصرہ آیت میں یہ قسم زیرِ بحث نہیں ہے۔

زیرتبصرہ آیت میں اگر کوئی پہلے سے عقیدہ ذہن میں نہ بٹھایا جائے' تو گرائمر کی رو سے حتی غائیہ کے استعمال کے لئے تمام شرائط اور قرائن اس میں پائے جاتے ہیں۔ اس لئے فاضل مصنف نے شاید گرائمر کی رو سے علماء کے ترجمہ کو چیلنج نہیں کیا۔ انہوں نے ایک فرضی مروجہ غیرقرآنی ''حلالہ'' کے تصور کو ذہن میں رکھتے ہوئے درج ذیل منطقی دلائل سے حتیٰ غائیہ کو چیلنج کیا ہے اور حتی سببیہ کو یہاں جائز قرار دیا ہے۔

(۱) طلاق کے بعد رجعت کا حق بھی صرف اسی مرد کو ہوگا' جس نے طلاق دی ہے۔ (صرف کا لفظ لا کر مصنف پہلے سابقہ شوہر کو رجعت کے حق سے محروم کر رہے ہیں)۔

(۲) زیرتبصرہ آیت کی وضاحت میں معلوم ہو چکا ہے کہ سابقہ شوہر تین مرتبہ طلاق دے چکا ہے' لہٰذا اس کے (رجعت کی صورت میں) چوتھے نکاح کا جواز نکل آئے گا۔ قرآن کریم میں چوتھی طلاق کا کوئی ذکر نہیں یا اس کے متعلق کوئی احکامات نہیں ہیں۔ اس لئے اس کی اجازت نہیں ہے۔

ان منطقی دلائل تک پہنچنے کے لئے فاضل مصنف اس آیت کے دو ٹکڑے کر کے اس کے علیحدہ علیحدہ مفہوم نکالتا ہے۔ حالانکہ ان دونوں ٹکڑوں کی ابتدا لفظ ''فان'' سے ہوتی ہے جو پچھلی کا تسلسل ہوتی ہے۔ زیرتبصرہ آیت تسلسل ''**الطلاق مرتٰن**'' یعنی پچھلی آیت کا ہے۔ **فان** دو الفاظ کا مجموعہ ہے۔ **فا** اور **ان** کا۔ ان کا اردو میں ترجمہ اگر اور **فا ان** کے صلہ میں اردو میں ''تو'' سے پہچانا جاتا ہے۔ یہ دونوں صرف شرط میں لائے جاتے ہیں۔ یہ دو جملوں پر داخل ہوتے ہیں۔ پہلے جملے کو شرط یا جملہ شرط اور دوسرے کو جواب اجز یا جملۂ جواب یا جملہ جزا کہتے ہیں اور دونوں کو ملا کر جملہ شرطیہ کہتے ہیں۔ پہلا جملہ یعنی جملہ شرط لازماً فعلیہ جملہ (جیسا کہ زیرتبصرہ آیت میں ہے) ہوتا ہے دوسرا جملہ یعنی جواب یا جزا فعلیہ (زیرتبصرہ آیت کے

مطابق) بھی ہوسکتا ہے اور اسمیہ بھی۔ جملۂ شرط کا فعل ماضی بھی ہوسکتا ہے اور مضارع بھی۔ اسی طرح جملہ جواب یا جزا فعل ماضی، مضارع، امر، نہی یا دعا پر مشتمل ہوسکتا ہے اور جملہ اسمیہ بھی ہوسکتا ہے۔

زیرتبصرہ آیت میں ایک ایسی آیت جو جملہ شرطیہ کے تمام قواعد اور الفاظ سے مزین ہے، پھر بھی مصنف کا اصرار ہے کہ اسے تسلسل کے تناظر کی بجائے آیت کے ہر ایک حصہ کو ایک جملہ کی شکل میں مکمل سمجھنا چاہئے اور اس تناظر میں اس کا مطلب معین کرنے سے بات سمجھ میں آئے گی۔ اگر فاضل مصنف اس آیت کو تسلسل کی نظر سے دیکھتے تو سب قرائن پہلے سابقہ شوہر کے رجعت کی طرف اشارہ دے رہے ہیں، جو شاید فاضل مصنف کو نا قابل قبول ہیں۔ اس لئے کہ وہ اس مشق سے حتی کا استعمال سببیہ کی بجائے غائیہ کرنے پر مجبور ہوتے۔ فاضل مصنف کا زیرتبصرہ آیت سے یہ استنباط اور وہ بھی لفظ ''جناح'' کی موجودگی میں کہ اس آیت سے طلاق کے بعد رجعت کا حق بھی اسی مرد کو ہوگا جس نے طلاق دی ہے، قابل تعجب ہے۔ فاضل مصنف یہاں لفظ جناح (گناہ) کا اطلاق کن معنوں میں کریں گے جبکہ ایک دفعہ کی مذکورہ طلاق کی صورت میں اس مرد پر اس کا اطلاق ہی نہیں ہوتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مصنف یہاں استخراج میں اپنی سوچ میں توازن کو برقرار رکھنے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ اس کے برعکس ان کا غلو میں مرتکب ہونے کا زیادہ شائبہ پایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ فاضل مصنف کا یہ کہنا کہ چوتھے نکاح کا قرآن میں ذکر نہ ہونے سے اس کی حرمت ثابت ہوتی ہے تو قرآن سے نافہمی ظاہر کرتی ہے۔ جیسا کہ شروع میں قرآن کے حوالے سے بتایا جا چکا ہے کہ قرآن کا اصول یہ ہے کہ جن رشتوں کو قرآن حرام قرار دیتا ہے، اس کی تفصیلات دینے کے بعد، باقی تمام رشتے جو ان سے ''وراء'' ہوتے ہیں، سب کو حلال گردانتا ہے اور حلال وحرام کی اتھارٹی بھی صرف اور صرف اللہ کے فرمان ہی سے ہوسکتی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی بھی چاہے وہ نبی کیوں نہ ہو، حلال وحرام متعین کرنے کی اتھارٹی نہیں رکھتا۔ لہٰذا قرآن کے اصول کے مطابق جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ تیسری طلاق کے بعد عورت اس مرد کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حرام ہو جائے گی، یہی اس کے حلال ہونے کی سند کہلائے گی۔ لہٰذا فاضل مصنف کو اپنی Energy کو صرف اور صرف اپنی Merit (خوبی) پر ہی تیسری طلاق کے بعد عورت کے حرام ہونے پر مزید تحقیق اور مستند دلائل سے ثابت کرنے میں ہی صرف کرنا چاہئے۔

ویسے فاضل مصنف کی تسکین کے لئے وضاحت کی جارہی ہے کہ اس کے ثبوت کے بغیر ہی قرآن حلالہ کے مروجہ تصور کو یکسر رد کررہا ہے اور یہ مسئلہ قرآنی مسئلہ ہی نہیں جس کو اہمیت دی جائے۔ حلالہ کے مروجہ تصور میں تینوں طلاقیں ایک ہی دفعہ تین بار طلاق، طلاق، طلاق دہرانے سے واقع ہوجاتی ہے۔ اس کی قرآن سے سند نہیں نکالی جاتی اور اس کی نہ ہی ملکی قانون اجازت دیتا ہے۔ ان دونوں میں طلاق کو مرحلہ وار طویل منازل سے گذار کر قانونی دستاویز کی شکل دی جاتی ہے۔

طلوع اسلام کا مقصد

جوں جوں ملک میں قرآنی فکر عام ہورہی ہے، طلوع اسلام کے خلاف پروپیگنڈا بھی تیزی سے بڑھایا جارہا ہے۔ حتیٰ کہ بعض طبقوں میں اس کی شدت اشتعال تک پہنچادی جاتی ہے۔ ہمیں اس پر کبھی اعتراض نہیں ہوا کہ جو کچھ ہم پیش کرتے ہیں اس سے اختلاف کیوں کیا جاتا ہے۔ ہم نے کبھی یہ نہیں کہا کہ ہم جو کچھ کہتے ہیں وہ خدا کی طرف سے وحی ہے جس سے کسی کو اختلاف کا حق حاصل نہیں۔ جو کچھ ہم پیش کرتے ہیں وہ قرآن کریم کی تعلیم کو سمجھنے کی انسانی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس میں سہو بھی ہوسکتا ہے اور خطا بھی۔ جو شخص ہمیں ہماری کسی غلطی پر متنبہ کرتا ہے، ہم اس کے شکر گزار ہوتے ہیں بشرطیکہ وہ اپنی بات کی تائید میں قرآن کریم کی سند رکھتا ہو۔ لیکن ہمارے خلاف پروپیگنڈا کرنے والوں کی کیفیت جدا ہے۔ وہ یہ نہیں کرتے کہ جو کچھ طلوع اسلام کہتا ہے اسے اس کے الفاظ میں اپنے قارئین یا سامعین کے سامنے پیش کر کے اس پر قرآن کریم کی روشنی میں تنقید کریں۔ وہ کرتے یہ ہیں کہ اپنی طرف سے ایک غلط بات وضع کرتے ہیں اور اسے طلوع اسلام کی طرف منسوب کر کے گالیاں دینا شروع کر دیتے ہیں۔ چونکہ ہماری قوم بھی عام طور پر سہل انگار واقع ہوئی ہے اس لئے کوئی اس بات کی تحقیق کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا کہ جو کچھ طلوع اسلام کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ اس نے کہا بھی ہے یا نہیں۔ اس لئے ان مخالفین کا حربہ کامیاب ہوجاتا ہے۔ اس مقصد کے لئے کہ جو لوگ دیانتداری سے تحقیق کرنا چاہیں، ان پر حقیقت واضح ہوجائے، ہم طلوع اسلام کے مقصد کو وقتاً فوقتاً سامنے لاتے رہتے ہیں۔ ذیل میں ہم مختصر الفاظ میں اس مقصد کو درج کرتے ہیں:

ہمارا مقصد یہ ہے کہ.....

۱۔ تنہا عقل انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت نہیں کرسکتی۔ اسے اپنی راہنمائی کے لئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی ضرورت۔

۲۔ خدا کی طرف سے عطا شدہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے ابد تک ضابطہ ہدایت ہے۔ لہٰذا اب نہ خدا کی طرف سے کسی کو وحی مل سکتی ہے نہ کوئی نبی یا رسول آسکتا ہے۔ قرآن کریم خدا کی آخری کتاب اور حضور رسالتمآب ﷺ خدا کے آخری نبی اور رسول ہیں۔

۳۔ قرآن کریم کا ہر دعویٰ علم پر مبنی ہے اور اس کی حقائق زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہیں۔ قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ جس حد تک انسانی علم ترقی کر چکا ہے وہ انسان کے سامنے ہو اور چونکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ خدا نے تمام کائنات انسان کے لئے تابع تسخیر کر رکھی ہے اس لئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے کے لئے کائناتی قوتوں کی تسخیر ضروری ہے۔

۴۔ نبی اکرم ﷺ کی سیرت مقدسہ، شرف و عظمت انسانیت کی معراج کبریٰ ہے۔ یہی وہ پاکیزہ سیرت ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) ہے۔ حضور ﷺ کی سیرت طیبہ کا جو حصہ قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی یا یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن سے باہر ہے سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضور ﷺ پر (معاذ اللہ) کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ بات غلط ہے۔ اسے حضور ﷺ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہئے۔ یہی اصول صحابہ کبارؓ کی سیرت مقدسہ کے سلسلہ میں بھی سامنے رکھا جانا چاہئے۔ جہاں تک حدیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو یا جس سے حضور نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

۵۔ دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں کو دوسرے انسانوں کی محکومی سے چھڑا کر ان سے خالص قوانین خداوندی کی اطاعت کرائے۔ قوانین کی یہ اطاعت ایک نظام مملکت کی رو سے ہوسکتی ہے اس کے بغیر دین (جو نظام زندگی کا نام ہے) متمکن نہیں ہوسکتا۔

۶۔ رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے دین کا نظام قائم فرمایا۔ اس نظام میں قرآن کریم کے احکام وقوانین کی اطاعت کرائی جاتی تھی اور جن امور میں قرآن کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے امور مملکت امت کے مشورہ سے سرانجام پاتے تھے۔

۷۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد دین کا وہی نظام حضور ﷺ کے خلفائے راشدینؓ نے جاری رکھا۔ اس میں امور مملکت سرانجام پانے کا وہی طریقہ تھا جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں رائج تھا۔ یعنی قرآن کریم کے احکام وقوانین کی اطاعت اور جن امور میں قرآن کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر امت کے مشورہ سے متعلقہ امور کے فیصلے۔ اس طریق کو خلافت علیٰ منہاج رسالت کہا جاتا ہے۔

۸۔ بدقسمتی سے خلافت علیٰ منہاج رسالت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہوگیا اور دین کا نظام باقی نہ رہا۔ اس سے امت میں انتشار پیدا ہوگیا۔ خلافت کے زمانے میں تمام امور دین کے نظام کے تابع رہتے تھے۔ لیکن بعد میں مذہب اور سیاست میں ثنویت پیدا ہوگئی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے۔

۹۔ ہمارے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ پھر سے خلافت علیٰ منہاج رسالت کا سلسلہ قائم کیا جائے جو امت کو احکام وقوانین خداوندی کے مطابق چلائے۔ اس نظام کی بلندترین اتھارٹی کو مرکز ملت کہا جائے گا اور اس کی طرف سے جاری شدہ احکام کی اطاعت خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت کے قائم مقام قرار پائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس نظام کو چلانے والوں کی اپنی زندگی سب سے پہلے قوانین خداوندی کے تابع ہوگی۔

۱۰۔ چونکہ دین کا نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہوگا' اس لئے اس میں موجود ثنویت ختم ہوجائے گی۔ یعنی اس میں یہ نہیں ہوگا کہ سیاسی معاملات کے لئے حکومت کی طرف رجوع کیا جائے اور مذہبی یا شخصی امور کے لئے مذہبی پیشوائیت کی طرف۔ اس میں یہ دونوں شعبے باہمد گر مدغم ہوجائیں گے۔

۱۱۔ جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہوجاتا' امت کے مختلف فرقے جس جس طریق پر نماز' روزہ وغیرہ اسلامی احکام پر عمل کر رہے ہیں' کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کوئی ردوبدل کرے یا کوئی نیا طریقہ وضع کر کے اسے ''خدا اور رسول ﷺ'' کا طریقہ قرار دے۔ یہ حق قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) کو پہنچتا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ امت کے اختلافات کو مٹا کر اس میں وحدت پیدا کرے۔

۱۲۔ قرآنی نظام کا مقصود یہ ہے کہ خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ نظام تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی' روٹی' کپڑا' مکان' علاج' تعلیم وغیرہ بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہو۔

۱۳۔ قرآن کا نظام اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد نظام ہے اس لئے نہ وہ دنیا کے کسی اور نظام میں جذب ہوسکتا ہے نہ ان سے مفاہمت کرسکتا ہے۔ خواہ وہ مغرب کا جمہوری سرمایہ دارانہ نظام ہو' یا سوشلزم کا آمرانہ اشتراکی نظام۔ اس کے نزدیک یہ سب نظام ہائے زندگی غیر خداوندی ہیں لہٰذا باطل۔

۱۴۔ جہاں تک احادیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو' یا جس سے حضور نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

۱۵۔ ہم' رسول اللہ ﷺ کے بعد' ہر قسم کے مدعی وحی کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔

۱۶۔ طلوع اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ مذہبی فرقہ سے (اسے فرقہ اہل قرآن سے بھی کوئی تعلق نہیں' نہ ہی یہ کوئی نیا فرقہ پیدا کرنا چاہتا

ہے اس لئے کہ اس کے نزدیک دین میں فرقہ سازی شرک ہے۔ امت کے مختلف فرقے جس طریق سے نماز، روزہ وغیرہ کی ادائیگی کرتے ہیں، ہم ان میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں کرتے۔ ہم صرف قرآن کریم کی تعلیم کو عام کرتے ہیں تاکہ کسی طرح پھر سے قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) کا قیام عمل میں آسکے۔ یہ ہے ہمارا مقصد، جسے ہم برسوں سے دہراتے چلے آرہے ہیں۔ اس کے خلاف جو کچھ ہماری طرف منسوب کیا جاتا ہے، وہ مخالفین کا گمراہ کن پروپیگنڈہ ہے۔

☆☆☆

جو حضرات طلوع اسلام کے اس مقصد سے متفق ہیں وہ مقامی طور پر اس فکر کے عام کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کی اس تنظیمی کوشش کا نام ہے ''بزم طلوع اسلام''۔ جو لوگ اس بزم کے ممبر بنتے ہیں ان سے نہ کوئی نیا عقیدہ منوایا جاتا ہے، نہ احکام خداوندی کے علاوہ کسی اور کی اطاعت طلب کی جاتی ہے، نہ وہ کوئی الگ پارٹی بناتے ہیں، نہ عملی سیاست میں حصہ لے سکتے ہیں، نہ وہ کسی کو اپنا پیر و مرشد سمجھتے ہیں نہ امیر و مطاع۔ یہ ان **متفق الخیال** احباب کی تنظیم ہوتی ہے جو یک نگہی و یک جہتی سے قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کی کوشش کرتے ہیں، اس کے سوا ان کا کوئی پروگرام نہیں ہوتا اور یہ جو کچھ کرتے ہیں اس میں نہ کوئی راز ہوتا ہے نہ پردہ، نہ ہی کسی قسم کی جلب منفعت۔

المختصر: مسلمانوں کے قلب و دماغ سے ہر قسم کے غیر قرآنی تصورات و نظریات اور معتقدات نکال کر ان کی جگہ خالص قرآنی تصورات پیش کرنا اور دلائل و براہین کی رو سے پیش کرنا طلوع اسلام کا مقصود و مطلوب ہے۔ اسمیں وہ، قوم کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو سب سے پہلے اپنے سامنے رکھتا ہے تاکہ وہ مغربی سیکولرازم اور اشتراکیت کے سیلاب سے بچ کر پاکستان میں صحیح قرآنی معاشرہ قائم کرنے کے قابل ہوسکیں۔

☆☆☆

قرآنی معاشرہ میں کیا ہوگا۔۔۔؟

۱۔ قرآنی معاشرہ میں ہر شخص کی عزت بلاتمیز قوم، رنگ، نسل، پیشہ، محض اس کے انسان ہونے کی جہت سے ہوگی۔ کسی کو پست یا ذلیل نہیں سمجھا جائے گا۔ برتری کا معیار یہ ہوگا کہ کوئی شخص اپنے فرائض کی بجاآوری میں کس قدر محنت اور دیانت سے کام لیتا ہے اور نوع انسان کو فائدہ پہنچانے کی خاطر کیا کرتا ہے۔

۲۔ کوئی شخص بے کس و لاچار اور بے یار و مددگار نہیں ہوگا۔ ہر ایک کی بات سنی جائے گی، اور تکلیف رفع کی جائے گی۔ ہر شخص کو انصاف ملے گا اور بغیر کچھ خرچ کئے ملے گا۔ کوئی صاحب اثر انصاف کے پلڑے کو اپنی طرف نہیں جھکا سکے گا۔

۳۔ کوئی فرد بھوکا ننگا یا بے گھر نہیں رہے گا۔ تمام افراد کے لئے خوراک، لباس اور مکان کا انتظام کرنا معاشرہ کے ذمہ ہوگا۔ یعنی قرآنی معاشرہ ہر شخص کی اور اس کی اولاد کی ضروریات زندگی بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہوگا۔

۴۔ معاشرہ کی یہ بھی ذمہ داری ہوگی کہ ہر شخص کی تعلیم و تربیت کا پورا پورا انتظام کرے جس سے انسان کی صلاحیتوں کی نشوونما ہو۔ بالفاظ دیگر معاشرہ کا وجود فرد کی ذات کی تکمیل کے لئے ہوگا۔

۵۔ ہر شخص اپنی پوری استعداد و محنت سے کام کرے گا۔ صرف وہ افراد کام نہیں کریں گے، جو کسی وجہ سے کام کرنے سے معذور ہوگئے ہوں، یہ نہیں ہوگا کہ کچھ لوگ تو محنت کرتے کرتے ہلکان ہوجائیں اور باقی لوگ ان کی کمائی پر مفت میں عیش اڑائیں۔

۶۔ ہر شخص اپنی محنت کے ماحصل میں سے اپنے لئے صرف اتنا رکھے گا جس سے اس کی مناسب ضروریات پوری ہوں۔ باقی اپنے دل کی رضامندی سے حاجت مندوں کی ضروریات کے لئے کھلا رکھے گا بلکہ عندالضرورت دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دے گا۔ ذات کی نشوونما کا یہی طریق ہے۔

۷۔ رزق کے سرچشمے (خواہ وہ زمین کی شکل میں ہوں یا کارخانوں کی صورت میں) قرآنی معاشرہ کی تحویل میں رہیں گے تاکہ وہ افراد معاشرہ کی پرورش کے کام آئیں۔ جب افراد کی ضروریات زندگی کی ذمہ داری معاشرہ کے سر ہوگی اور رزق کے سرچشمے حاجت مندوں کے لئے کھلے رہیں گے تو کسی کے لئے دولت سمیٹ کر جمع کرنے اور جائدادیں بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔

۸۔ ہر معاملہ کا فیصلہ خدا کے احکام (قرآن کریم) کے مطابق ہوگا نہ کہ کسی خاص گروہ یا طبقہ کی مرضی کے مطابق (اس معاشرہ میں گروہوں' لیڈروں اور پارٹیوں کا وجود ہی نہیں ہوگا۔) اس لئے اس میں نہ کسی قسم کا جور ہوگا نہ استبداد' نہ ظلم ہوگا نہ زیادتی۔ اسے نظام خداوندی یا قرآنی نظام معاشرہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۹۔ ہر شخص کھل کر بات کرے گا۔ اس کے دل میں نہ کسی طرف سے نقصان پہنچنے کا ڈر ہوگا نہ کسی کو نقصان پہنچانے کا خیال۔ ایک دوسرے پر اعتماد اور بھروسہ ہوگا اور فریب کی گنجائش نہیں ہوگی۔ اس طرح گھروں کے اندر سکون اور معاشرہ کے اندر اطمینان ہوگا۔

۱۰۔ یہ سب کچھ اس لئے ممکن ہوگا کہ ہر شخص قوانین خداوندی کے محکم اور مکافات عمل کے برحق ہونے پر یقین رکھے گا۔ یہ نظام قائم ہی ان بنیادوں پر ہوگا۔ اس میں قرآن کریم کی مستقل اقدار عملاً نافذ ہوں گی۔

تحریک طلوع اسلام' پاکستان میں اس قسم کے نظام کی تشکیل کے لئے وجود میں لائی گئی ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ نوع انسان کی مشکلات اور مصیبتوں کا حل اسی قسم کے نظام کے قیام میں مضمر ہے تو اس کے قیام و عمل کے لئے اپنا فریضہ ادا کیجئے اور ہم سے تعاون فرماتے ہوئے ادارہ یا قریبی بزم سے رابطہ کیجئے۔

چیئرمین ادارہ آپ سے اپیل کرتا ہے کہ اگر آپ ان مقاصد سے متفق ہیں اور ان کو بروئے کار لانے میں اپنے آپ کو آمادہ پاتے ہیں اور مدد کرنا چاہتے ہیں تو اپنے مختصر کوائف قریبی بزم یا ادارہ کو بھجوا دیں۔ آپ حضرات بحدِ استطاعت ان مقاصد کی معاونت کر سکتے ہیں لیکن آپ پر ادارہ کے قواعد و ضوابط کی پابندی اور وابستگی لازمی نہیں ہوگی۔

چیئرمین ادارہ طلوع اسلام' ۲۵۔ بی' گلبرگ ۲' لاہور

☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر انعام الحق

حکمت کی باتیں

(۱) اخلاقی اور سماجی برائیوں کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کرنے کا واحد ذریعہ ذاتی ملکیت کا خاتمہ ہے۔ (افلاطون)

(۲) کہتے ہیں کہ صحیح درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے لیکن ہر چیز کا فیصلہ ثمرات تک اٹھائے رکھنا بھی دانائی نہیں۔

(۳) خدا خود میری جگہ محسوس کر سکتا ہے، نہ حکم لگا سکتا ہے، اور نہ مختلف راستوں میں کسی راستے کا انتخاب کر سکتا ہے۔ (اقبال)

(۴) خودی یا ذات میرا ارادہ، میرے احکام، میری تمنائیں اور میرے ادراک کی تعبیر، تفہیم اور تشخص ہے۔ (اقبال)

(۵) اچھی حکومت وہ کہلاتی ہے جس میں عوام حکام کے تابع ہوں اور حکام قانون کے تابع۔ (سولن)

(۶) فیثا غورث نے افلاطون سے دو سو برس پہلے عورت کو مرد کے مساوی حقوق دینے پر اصرار کیا۔

(۷) انسان کیا ہے؟ فانی دیوتا۔ دیوتا کون ہے؟ غیر فانی انسان۔

(۸) (سقراط کی پسندیدہ دعا) اے میری روح! صبر و استقامت سے کام لے۔ اس سے پہلے تو اس سے بھی بڑے مصائب کا سامنا کر چکی ہے۔

(۹) نیک انسان ہی فاعلِ مختار ہو سکتا ہے کیونکہ اس کی عقل و دانش اس کے سرکش جذبات پر قابو پا لیتی ہے۔ (زینو)

(۱۰) اسلاف کی بکواس کا کس قدر سرمایہ کتابوں میں ایسا موجود ہے، جس کی تمام روشنائی ضائع ہو گئی۔ عقل کے سوا کوئی امام نہیں (ابوالعلاء معریٰ، شاعر)

(۱۱) نوعِ انسان کی مشکلات کا خاتمہ نہیں ہو گا جب تک آخری بادشاہ کو آخری پروہت کی انتڑیوں سے پھانسی نہ دے دی جائے گی۔ (ویدرو)

(۱۲) جب کسی مذہب کے احیاء یا تجدید کی کوشش شروع ہو، تو یہ اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ وہ مذہب ختم ہو چکا ہے۔ اس لئے کہ زندہ چیز کے احیاء کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(۱۳) منزل یا نصب العین کا تعین صرف عقل و خرد ہی کر سکتی ہے۔ یہ بات جذبہ و وجدان کے بس کی نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یکے از مطبوعات باغبان ایسوسی ایشن

ہمارا ماٹو ''قرآن فہمی اور باغبانی''

☆ قرآن کریم میں ہے: وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ (۶/۱۴۱)۔

''جب وہ پھل لائیں اور ادا کرو حق اللہ کا اُسی دن جب اُن کی فصل کاٹو''۔ (ترجمہ مولانا سید شبیر احمد شاہ)

زمین اللہ جل جلالہٗ کی، سورج اللہ کا، ہوا اللہ کی، پانی اللہ کا۔ انسان صرف اللہ کی زمین پر محنت کرتا ہے، مزارعہ ہے۔ اگر دسواں حصہ اللہ کے نام کا یتیموں، مسکینوں، غریبوں، بے زمین، بے مکانوں کو دینا شروع ہو جائے تو ملک سے غریبی کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ فصل کاٹنے کے دن گندم کے دانہ کے ساتھ ڈنٹھل، مکئی کے ساتھ گھاس اسی طرح باجرہ، جوار، چرئی وغیرہ اور پھل سیب، مالٹا، کنو، آم، لیموں.....وغیرہ سب کا عشر ہے۔

میں نے پنجاب کے صوبائی محتسب اعلیٰ کے ہاں اپیل 482/2003=6762/2003 اور 2969/2006 کے ذریعہ عشر کا مسئلہ حل کرنے کی کوشش کی۔ اب ان کے خلاف جناب خالد مقبول صاحب گورنر پنجاب کے ہاں اپیل نمبر 980 مورخہ 18/7/2007 زیر سماعت ہے۔

☆ باغات لگانا

باغات لگانے کا پرانا طریقہ جنگل نما ہے۔ اس میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ہر قسم کے پھلدار پودہ جات لگا دیئے جاتے تھے۔ درختوں کی جڑیں ایک دوسرے کی جڑوں تک پہنچ جاتی ہیں، بڑے درختوں کی ٹہنیاں ایک دوسرے کو متاثر کرتی ہیں۔ جنگل نما یہ پرانے باغات ختم کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ اب جدید باغات لگانے کے لئے جدید مہارت اور تجربات سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ باغات لگانے کا جدید فن باقاعدہ کورس کی شکل میں عام ہو رہا ہے۔ اس کے لئے محکمہ زراعت، زرعی یونیورسٹیاں اور NRSP سکھی ویلفیئر سوسائٹی، UNDP، باغبان ایسوسی ایشن راہنمائی کے لئے کام کر رہے ہیں۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی بھی باقاعدہ کورس کرا رہی ہے۔ یہ جدید باغات قطاروں میں لگائے جاتے ہیں۔ یہ مربع شکل یا مستطیل شکل میں ہوتے ہیں۔ بڑے پودوں کا درمیانی فاصلہ 15 فٹ، چھوٹے پودوں کا درمیانی فاصلہ 10 فٹ اور گڑھا 3'x3'x3' کی مناسبت سے تیار کیا جاتا ہے۔

پتہ رابطہ: (1) ملک حنیف وجدانی، صدر باغبان ایسوسی ایشن، سنبل سیداں، نیومری۔

(2) صبینہ یاسمین سینئر نائب صدر باغبان ایسوسی ایشن، ٹبی سیداں، سوہاوہ، جہلم۔

HUMAN PERSONALITY

By
Ubedur Rahman Arain

Lao Tzu, the venerable Chinese philosopher stated, “Knowing others is wisdom, knowing yourself is enlightenment.” As Muslims, we are acutely aware of the importance of self reflection in the path to spiritual enlightenment, as Allah has not only mentioned the benefits of thought before action (34:46, 6:50), but also set aside the Holy Month of Ramadan entirely for that purpose. As we think on the fate of the millions of unfortunates in the world, we also have to turn that searchlight into ourselves and see how true we are staying to the principles set by Allah in the Holy Quran. Ramadan gives us a chance once in a year to pause and maybe for many busy people register the many changes a year has brought them. Be they trivial or earth shattering, every experience we’ve had in the year directly impacts the way we behave and think in this world.

Deliberate changes we make of our own free will, even if they seem insignificant at the time, can have very radical and long term effect on you and the society around you. The way your personality and conscious interactions affect the people around you is at the core of Islamic society. And the way that your personality develops is at the heart of the values Allah lays down in the Holy Quran. Everyone is born with the beginnings of a unique personality given to us by Allah. God tells us in the Holy Quran that He gives every human being a form of divine energy (32:9). This divine energy is the basis of ones personality, commonly identified as the “human self” (or ‘Nafs’ in Arabic). This personality is in nascent form at birth and develops over the years. Firstly, by the values taught at home and, thereafter, with education and training as the child grows and becomes an adult.

However, the personality does not stop growing once a person reaches adulthood. It really goes on changing as a person interacts with the society at large. Whatever we do, affects our ‘Nafs’ (6:164). But just as you can create positive changes, strengthening your personality, you can easily create negative changes, damaging the personality severely. The Holy Quran suggests that the ‘Nafs’ has potential for maturity and integration or destruction and disintegration (92:7-10). It also tells us that the self develops when we give others from what we have (93:18) and that it is damaged if we go against the divine values (4:111).

This process is continuous throughout our lives. As long as we live within and follow these permanent values, the personality keeps on growing (91:9). That is why the establishment of the correct values in society is extremely important. The

right values set the parameters within which personalities can grow and flourish into responsible, useful human beings. The primary purpose of religion was to give us these values; and that is the reason for preservation of the Holy Quran, being the primary source of these values. I am sure all of us have come across a person with such a well balanced personality. A person like that is not easily forgotten as they touch everyone with their humility, fairness, and sense of personal responsibility. One such person was my dear friend Hamad Alghanim (Abu Talal), who passed away earlier this year. His life is a testament to living by God's divine values and what the truly developed Nafs can achieve.

I would like to share one event of his life. Due to the 1990 invasion of Kuwait, all Kuwaiti businesses were shut down and he was out of Kuwait at that time. When Abu Talal came back, he was adamant that his first priority should be to pay all the dues of those employees who could not come back to Kuwait due to their personal reasons or government restrictions. He really didn't have the time and the money to be locating those employees and paying their dues. He could have easily turned the other way, focused on getting his business reopened and forgotten about the old employees. But his Nafs was so strong, his sense of obligation so refined, that he felt he had no other course of action. He told me at that time that their needs were more than his and it was his responsibility to meet them! Such developed personalities not only beautify this world they are also guaranteed Heaven by God (89:27).

Contemplating on our own personality using the principles set in the Holy Quran as a guide can only lead to a better, stronger personality. There is no limit to what such a highly developed personality can achieve. A person used to self reflection and focused on staying on the right path is truly mature, balanced and has the right attitude to create positive effects in the society. This way we become masters of our own destiny and a society made up of such developed personalities creates heaven on earth. We all need to strive for such a society.

****

A L L A H

By

Maj Gen (Rtd) Ihsan-ul-Haq

The need for an exercise to define the "Limits of Allah" arose because God gave humans the power of self determination. The forces of nature (Angels) (Malaika) could do no wrong because they had no choice. They did what they were told to do

يخافون ربهم من فوقهم ويفعلون مايؤمرون (16/50).

In a symbolic story, the Quran narrates a discussion between Allah and the forces of nature when He took a decision that a species was to be created who would have a freedom of choice. They could disobey God's commands if they so wished. The forces of nature respectfully submitted that the universe was running smoothly because God's commands were being obeyed without question. Would there not be a risk of bloodshed and confusion if a species were allowed to not only determine its own way of life but also to defy God's guidance at will? God conceded that it was possible but as the growth of a species was possible only when it was given freedom to choose, taking such a risk was necessary. Humanity would not be left in the lurch. From time to time, God would convey His broad guidance to all corners of the civilization through His Prophets. They would not add any of their own ideas in the message given to them. After the prophets' death, some of their selfish followers would add or subtract from the message for their own personal benefit. God would then send further messenger to restore the purity of the message.

ومارسلنا من قبلك من رسول ولانبي الا اذا تمنى القى الشيطان في امنيته فينسخ الله مايلقي الشيطان ثم يحكم الله اياته والله عليم حكيم

"Even before you, We have been sending Our prophets with Our message. After the Prophets left, selfish people would corrupt the message for their selfish benefits. God would then send other Prophets who would establish the original purity of His word" (22/52).

This process would continue until humanity would come of age. Muhammad of Arabia would, then, deliver the final word of God and humanity, from then onwards, would be at liberty for all times to come, to guide itself by that message, ignore it or deliberately disobey it.

ولكل امة رسول فاذا جاء رسولهم قضي بينهم بالقسط وهم لايظلمون

"And We send Our messengers to every people in history. Matters of state are decided justly under the guidance of these messengers and nobody is deprived of his right …" (10/47).

قل يايها الناس اني رسول الله اليكم جميعا الذي له ملك السماوات والارض لااله الاهو

Say : O mankind, surely I am the messenger of Allah to you all. His is the kingdom of heavens and earth. There is no law giver but Him…" (7/158).

Since the dawn of civilization, Allah has been sending His messengers to Babylonians, Egyptians, Greeks, Romans, Chinese, Indians, Iranians and other civilized people in history at various times.

ورسلا قد قصصناهم عليك من قبل ورسلا لم نقصصهم عليك....

"And We send messengers We have mentioned to you in the Quran and many other messengers We have not mentioned to you…." (4/164)

It was the duty of these messengers to convey the divine value system to their people and work hard to set up a just society, based on these value system. Thus did Allah help human beings by providing them guidance in the form of a value system which would help them in setting up a just, peaceful and prosperous society.

The Muslims believe that Quran is the last of God's revealed books.

.....اليوم اكملت لكم دينكم واتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم الاسلام دينا....

"As of today, I have perfected for you your religion and completed My favors to you and chosen for you Islam as a religion …." (5/3).

The Quran here stresses that there will never ever be any variation or change in the value system as set out in it by Allah.

مايبدل القول لدى ومانا بظلام للعبيد

"My value system will never ever change. If it did, it would be unfair to people" (50/29).

سنة الله التي قد خلت من قبل ولن تجد لسنة الله تبديلا

"Divine value system has always been constant. It has never changed. And never ever will it change in the future" (48/23)

There was always been a school of thought advocating that values are relative. They become out of date with time. We must keep up with the times by continuing to adopt new values to cope with new situations. The Quran differs with this view. It becomes all the more important to become acquainted with the Quranic value system because if its claim is correct, we might as well profit from the guidance offered in such a value system.

In order to obtain full value from such a value system, the Quran recommends that this system should be adopted in full.

يايها الذين امنوا ادخلوا في السلم كافة ولاتتبعوا خطوات الشيطان.....

"O you who believe, adopt this system in toto and do not mix your (Human) value system in to it …" (2/208).

Only confusion would ensue if Quranic value system was adopted in certain spheres of life and a value system given by another individual or institution was adopted in other spheres. This is called شرك 'Shirk' - assigning sovereignty to other than Allah, and is strictly discouraged in frequent passages of the Quran. Sovereignty belongs only to Allah. This is a highly important point for those who wish to adopt Islam as their way of life. Formulation of permanent values, applicable for all times to come is only the prerogative of Allah. He has listed them in the Quran, all previous divine books have been tampered with by humans and they are no longer a completely authentic record of divine values. Humans have no mandate to evolve a permanent value system. They only legislated within Allah's Limits in their times.

Why should human adopt divine values? The Quran exhorts that they should do so because it is in their own interest. It would not only bring about peace and prosperity in their society جنة' Jannah' (Paradise) but it would also elevate them to the level of امة وسطا Ummah Wasata) - a super power, balanced, just and capable of bringing about peace and harmony among their contemporary societies.

وكذلك جعلناكم امة وسطا لتكونوا شهداء على الناس.....

"And thus We have made you an exalted nation that you may be able to keep an eye over your contemporary people…" (2/143).

On the other hand, if humans choose to live a life in defiance of divine values, this will result in a miserable state of society جهنم 'Jahnnam' (Hell). These

people will stagnate. Their further progress will stop جهنم 'Jahaeem' (Stagnation). All this because they chose to bring this upon themselves.

ان الله لايظلم الناس شيئا ولكن الناس انفسهم يظلمون
"Surely, Allah wrongs not men in aught but men wrong themselves" (10/44).

Whether or not people are following divine values correctly will become evident by seeing their achievements in the world.

Mankind has the option of accepting or rejecting divine value system. It does not have the power to alter the consequences of adopting a certain course of action. If humans choose to live in defiance of God's laws, misery will inevitably result whatever powers humans might use to prevent this from happening.

من كان يريد العزة فلله العزة جميعا اليه يصعد الكلم الطيب والعمل الصالح يرفعه والذين يمكرون السيئات لهم عذاب شديد....
"Whoever desires might, then to Allah belongs the might wholly. To Him do ascend the goodly words, and the goodly deeds, he exalts it . And, those who plan evil for them is a severe chastisement. And, their plan will perish" (35/10)

If a set of people comes to sad times in consequence of their rejection of divine values, they can change their condition only if they retrace their steps توبه 'Tauba' (Retraction) and adopt divine values from where they went wrong 'Islah' (Correction).

.....ان الله لايغير مابقوم حتى يغيروا ما بأ نفسهم واذا اراد الله بقوم سوءا فلا مرد له ومالهم من دونه من وال
"Surely, Allah changes not the condition of a people, until they change their own condition. And when Allah intends evil to a people, there is no averting it, and besides Him they have not Protector" (13/11).

God makes it abundantly clear in many passages of the Quran that it is by His laws alone that nations rise and fall.

قل اللهم مالك الملك تؤتي الملك من تشاء وتنزع الملك ممن تشاء وتعز من تشاء وتذل من تشاء....

"Say O God, You are the possessor of all power. It is by Your laws alone that people acquire power and lose power. It is by Your laws alone that people become great and respected or small and humiliated" (3/26).

God's laws are applicable universally. There is no discrimination of any description on account of race, religion, colour, nationality or whatever. God has promised that His laws will apply in all circumstances and at all times

ان الله لايخلف الميعاد.....

"God can always be depended upon to fulfill His promise" (3/9)

Sometimes, it appears to an immature mind that adoption or rejection of divine values is not resulting in promised results. More often than not, an adoption of a course of action takes a while before results are manifest. In fact, the adoption of a correct course of action might well initially results in hardships. But people with a vision are convinced **ایمان بالغیب** (Faith in the unseen) that a correct action will, in the ultimate analysis, bring about a good reward, whatever the attendant difficulties attained in earlier stages. When enjoining faith in the unseen, the Quran is not asking for blind faith or a faith in the unknown, but a conviction that appropriate results will definitely accrue in due course of time whatever type of action is undertaken although such results might not be obvious in initial stages.

We have seen in the above discussion what part Allah plays in the formulation of His value system and some of the ways in which this system works. A full comprehension of the divine value system would be much facilitated if Allah, wherever mentioned in the Quran in this context, would be deemed as " The laws of Allah" rather than Allah as a person. We will now discuss what part the Prophets of Allah play in propagating these values and in demonstrating by their actions that these values are, in fact, practicable and useful.

****